مرزا سلیم بیگ :

"داستانِ تاریخِ اردو" ایک مطالعہ

(۱)

"داستانِ تاریخِ اردو" حامد حسن قادری کی تالیف کردہ تاریخِ نثر کا تاریخی نام ہے ، اس تالیف کا آغاز انھوں نے ۱۹۳۸ء میں کیا اور "داستانِ تاریخِ اردو" سے یہی عدد برآمد ہوتے ہیں۔ یہ کتاب تقریباً چار برس میں مکمل ہوئی ، مؤلف نے اس کی تاریخِ تکمیل "بوستانِ تاریخِ اردو" سے نکالی ہے - یہ پہلی مرتبہ ۱۹۴۱ء میں خواجہ فراست حسین کے اہتمام سے آگرہ برقی پریس ، آگرہ میں چھپی اور اسے لکشمی نرائن اگروال ، تاجر کتب آگرہ نے شایع کیا - اپنی اشاعت کے فوراً بعد ہی یہ کتاب مقبول ہوگئی اور جب کچھ ہی عرصے میں کتاب کے تمام نسخے فروخت ہوگئے تو آگرہ کے ناشر نے دوسرے ایڈیشن کا تقاضا کیا -

۱۹۵۵ء میں مؤلف پاکستان آگئے تو یہاں کے "متعدد ناشرین نے ان سے رجوع کیا تاکہ وہ اس کتاب کو یہاں چھاپ سکیں مگر انھوں نے کبھی اجازت نہیں دی ، ناشرین نے انھیں سمجھایا کہ اس پر کوئی قانونی پابندی نہیں ، مگر انھوں نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ اخلاقی پابندی بھی تو ہے - پھر آگرہ ہی سے ۱۹۵۷ء

میں اس کا دوسرا ایڈیشن شایع ہوا، مگر ان کے انتقال کے بعد یہ کتاب کراچی سے شایع ہوئی"۔۱ جمیل زبیری کے اس بیان سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اس کتاب کا تیسرا اور پاکستانی پہلا ایڈیشن مؤلف کی اجازت کے بغیر ان کی وفات کے بعد شایع ہوا، اس سلسلے میں ڈاکٹر سرور اکبرآبادی نے بھی کچھ اسی قسم کے خیالات کے اظہار کے بعد آخر میں یہ صراحت کی ہے کہ:

"یہی کتاب اردو اکادمی سندھ نے قادری صاحب کی اجازت سے شایع کی مگر اس وقت جب ان کے صاحبزادے ڈاکٹر خالد حسن قادری نے آگرہ سے لکشمی نرائن اگروال کا تحریری اجازت نامہ ان کی خدمت میں پیش کردیا"۔۲

حالانکہ اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن کے ناشر جناب علاءالدین خالد صاحب کا کہنا یہ ہے کہ:

"لکشمی نرائن اگروال، آگرہ سے مولانا کا معاہدہ صرف دوسرے ایڈیشن تک کا تھا اور تیسرے ایڈیشن اور اس کے بعد کے ایڈیشن کا معاہدہ مع اور تصنیفات کے راقم سے کیا گیا تھا"۔۳

۱۔ جمیل زبیری: "میرے استاد، پروفیسر حامد حسن قادری"، غیرمطبوعہ مقالہ مخزونہ ذخیرۂ ذاتی ڈاکٹر سرور اکبرآبادی، کراچی۔

۲۔ ڈاکٹر سرور اکبر آبادی: مقالہ بعنوان "مولانا حامد حسن قادری"، مشمولہ شفق، کراچی، مرتبہ سرور اکبر آبادی، بابت جولائی ۱۹۷۷ء، ص ۱۵۹۔

۳۔ علاءالدین خالد: مکتوب بنام راقم، مورخہ ۲۹ جنوری ۱۹۸۹ء، از کراچی۔

یوں دوسرے ایڈیشن کی فروخت کے بعد اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۳ء میں اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے شایع کیا اور بہ قول ناشر " اس پر علیحدہ دیباچہ قادری صاحب نے خود لکھا۔ اس میں انھوں نے 'حک و اصلاح اور ترمیم و اضافے' کا اعتراف کیا ہے" ۔۱ اور مؤلف نے اس کی تاریخ " دیباچہ' داستان تاریخ اردو" سے نکالی ہے۔ اس کے بعد اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں شایع ہوا ہے۔

(۲)

اپنی اس تالیف کی تدوین کے سلسلے میں مؤلف "سیرالمصنفین" (۱۹۱۴ء) از محمد یحییٰ تنہا اور مولانا احسن مارہروی (م ۱۹۴۰ء) کی تصنیف " تاریخ نثر اردو" بنام تاریخی " نمونہ' منثورات " (۱۹۳۰ء) سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے کہ " سیرالمصنفین" میں پہلی مرتبہ نثرنگاروں کی طرف توجہ کی گئی اور " نمونہ منثورات " میں نثر اردو کے صنف وار نمونے صدی وار ترتیب دیے گئے ہیں اور مؤلف کے الفاظ میں یہ " اپنی نوعیت کی منفرد تالیف ہے "۔۲ اس کے بعد " ارباب نثر اردو" (۱۹۲۷ء) مؤلفہ مولوی سید محمد (م سنہ) ہے، جس میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے حالات اور نمونے ایک خاص ترتیب سے یک جا کیے گئے ہیں اور بہ قول حامد حسن قادری " تاریخ کے اس دور کا حق ادا

۱۔ علاء الدین خالد : مکتوب بنام راقم ، مورخہ ۲۹ جنوری ۱۹۸۹ء ، از کراچی۔

۲۔ حامد حسن قادری : " داستان تاریخ اردو" ، طبع اول ، آگرہ ، لکشمی نرائن اگروال ، ۱۹۴۱ء ، ص ج۔

کردیا " ۔۱ یہی وجہ ہے کہ اپنی کتاب میں حامد حسن قادری نے بھی تاریخ وار ارتقائے اردو کے تذکرے کے ساتھ ہر دور کے تقریباً تمام مشاہیر ادب کے حالات اور ان کی تحریروں کے نمونے درج کیے ہیں اور ان پر تبصرے بھی کیے ہیں۔

اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب اصناف کی تاریخوں میں شمار ہوتی ہے، جسے جزوی تاریخ ادب بھی کہا جاتا ہے۔ چوں کہ ادب کی تاریخ خواہ جزوی ہو یا جامع، ضمنی طور پر متعلقہ زبان کی تاریخ بھی ہوتی ہے، اس لیے مؤلف داستان تاریخ اردو نے اس کتاب کی ابتداء میں اردو زبان اور اس کی نثری تاریخ سے متعلق ابتدائی ۳۰ صفحات پر مبنی ایک تمہیدی نوعیت کا مضمون شامل کیا ہے، اس سے مؤلف نے اردو زبان اور اس کی نثری تاریخ کے پس منظر اور تمہید دونوں کا کام لیا ہے۔ اس کے بعد مؤلف نے اردو نثر کی تاریخ کو چھے مسلسل ادوار میں تقسیم کیا ہے، جو مجموعی طور پر ۱۳۴۷ء (سلطنت بہمنی) سے لے کر ۱۹۳۳ء (بعد از غدر) تک محیط ہیں۔

ان ادوار کی ترتیب و تقسیم میں مؤلف نے متوسطین اور متاخرین کی پرانی تخصیص سے مدد لینے کے بجائے وقت، دبستان، دور حکومت اور اہم ادبی واقعات کو بنیاد بنایا ہے جو اردو کی ادبی تاریخ نویسی میں پہلی مثال ہے۔ لیکن اس سلسلے میں "زمانہ" کان پور کے مبصر کا خیال ہے کہ:

> "مؤلف نے پانچواں دور ۱۸۷۱ء سے لے کر ۱۹۰۰ء پر ختم کر کے چھٹا دور بیسویں صدی کے آغاز تک کیا

۱۔ حامد حسن قادری: "داستان تاریخ اردو"، طبع اول، آگرہ، لکشمی نرائن اگروال، ۱۹۴۱ء، ص ج۔

ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ پانچویں دور کے ختم ہونے سے پہلے چھٹا دور کیسے شروع کردیا گیا ہے اور چھٹا دور جو پانچویں دور کے بعد آتا ہے اس کا عہد غدر کے بعد سے کیسے قائم کر دیا گیا ہے، جبکہ خود پانچواں دور ۱۸۷۱ء سے آغاز ہوتا ہے"۔۱

اس کے بعد مبصر مزید رقم طراز ہیں کہ "یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ پانچویں دور کو چھٹے دور سے کیوں علیحدہ رکھا گیا ہے"۔۲ کیوں کہ دور قائم کرنے میں صرف یہ بات ملحوظ خاطر ہونا چاہیے کہ دونوں ادوار کے طرز تحریر میں نمایاں فرق ہے یا نہیں۔ اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں ادوار کی تحریرات میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

(۳)

ادبی تاریخ کے سلسلے میں ماخذ کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مؤرخین اس سلسلے میں بے حد احتیاط سے کام لیتے ہیں اور حتی المقدور بنیادی ماخذات تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ موجودہ دور کی تصانیف میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تصنیف "تاریخ ادب اردو" کو بہ طور مثال پیش کیا جا سکتا ہے کیوں کہ انھوں نے ماخذات کے سلسلے میں بہت دقتِ نظر اور احتیاط سے کام لیا ہے اور اولین ماخذات تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

۱۔ مبصر: "زمانہ" کان پور، جلد ۷۷، نمبر ۳ بابت مارچ ۱۹۴۲ء، ص ۱۵۸۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۵۸۔

اس حوالے سے اگر حامد حسن قادری کی تالیف کا جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اس معاملے میں اتنی محنت سے کام نہ لیا جتنا اس موضوع کا تقاضا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ماخذات کے ضمن میں یہ تالیف زیادہ اچھا تاثر نہیں چھوڑتی۔ یہاں ڈاکٹر جمیل جالبی اور حامد حسن قادری کی تالیفات کا موازنہ مقصود نہیں، لیکن پھر بھی یہ بات اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے کہ حامد حسن قادری نے اس معاملے میں بیش تر اوقات ثانوی مآخذ پر اکتفا کر لیا، ان کی چھان بین نہیں کی اور نئی معلومات کے لیے اپنے علاقے سے باہر کے علمی اسفار نہیں کیے، البتہ جو معلومات ان کے علم میں آئیں ان کے اظہار میں بخل سے کام نہیں لیا، اور جہاں کہیں ممکن ہوا اپنے ماخذات کی نشاندھی بڑے انکسار اور دیانت داری سے کی (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ضمیم اوّل)۔

اسی ضمن میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مؤلف نے بیش‌تر مصنفین کے لیے ان کی تصانیف سے براہ راست استفادہ کیا لیکن چند ایک مقامات پر اس معاملے میں بھی احتیاط کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ مثال کے طور پر محمد حسین کلیم دہلوی کے ذکر میں مؤلف نے ثانوی ماخذ پر بھروسا کیا اور اس سے بھی صحیح نتائج اخذ کرنے سے قاصر رہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> "تذکرۃ الشعراء" [صحیح تذکرۂ شعرائے اردو] میں کلیم کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے 'فصوص الحکم' کا اردو میں ترجمہ کیا، میر حسن کے الفاظ یہ ہیں: "در ہندی نثر کتابے ایجاد کردہ" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۱۶۴)۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ صاحب "تذکرۂ شعرائے اردو" کی مذکورہ رائے کا ترجمۂ فصوص سے کوئی تعلق نہیں۔ ترجمۂ فصوص کے بارے میں ان کے الفاظ یہ ہیں: "فصوص را کہ کتابے عربی است بہ زبان ریختہ ترجمہ کردہ"۔۱ اس جملے کے بعد مؤلف کا نقل کردہ جملہ آتا ہے اور اس کی بھی صحیح عبارت یوں ہے: "کتابے در نثر ہندی نیز ایجاد نمودہ"۔۲

اور دوسری بات یہ ہے، کہ "میر حسن نے ترجمۂ فصوص کو زبانِ ریختہ میں بتایا ہے، جس سے ترجمۂ فصوص کا منظوم ہونا مراد ہے۔ مصحفی نے 'تذکرۂ ہندی' میں ترجمۂ فصوص اور کلیم کی ایک اور منظوم تصنیف 'دہ مجلس ہندی' کے لیے صراحتاً 'بہ سلک نظم کشیدہ' کے الفاظ استعمال کیے ہیں جس کے بعد ترجمۂ فصوص کے منظوم ہونے میں کوئی شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی"۔۳

اس کے بعد غلام امام خان ترین حیدرآبادی کے ذکر میں مؤلف کا بیان ہے کہ:

> "انھوں نے دو کتابیں لکھی ہیں ... 'تاریخِ رشید الدین خانی' ... یہ عجیب بات ہے کہ غلام امام

۱۔ میر حسن دہلوی: "تذکرۂ شعرائے اردو"، بہ تصحیح و تنقید مولانا حبیب الرحمان خان شروانی، دہلی، انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، ۱۹۴۰ء، ص ۱۳۸۔

۲۔ ایضاً، ۱۳۸۔

۳۔ ڈاکٹر نجم الاسلام: "فضلی کی کربل کتھا"، نقوش، لاہور، شمارہ ۱۱۸، بابت سالنامہ جولائی ۱۹۷۳ء، ص ۶۰۔

خاں مصنف «رشیدالدین خانی» [صحیح «تاریخ رشیدالدین خانی»] نے یہ دیباچے کی عبارت جو بالیقین ان کی اپنی تحریر ہے، ترجمہ نہیں ہے، بالکل طرز قدیم میں لکھی ہے، بےقاعدہ ہے، لیکن خود کتاب کی عبارت نہایت صاف، مربوط اور سلجھی ہوئی ہے" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۸۳-۲۸۱)۔

جب کہ اس سلسلے میں نصیرالدین ہاشمی کا بیان ہے کہ "تاریخ رشید الدین خانی" کا دیباچہ شمالی ہند کے ایک بزرگ سید محمد حسین اغلب موہانی نے قلم بند کیا، اور اسی سے کتاب آغاز ہوتی ہے"۔۱ نصیرالدین ہاشمی کی اس صراحت کے بعد مؤلف کا بیان خارج از بحث ہے۔

یہی نہیں اس قسم کی مثالیں اور بھی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ مؤلف نے یہ کتاب، گھر میں بیٹھ کر اس مواد کی روشنی میں ترتیب دی، جو انھیں میسر آیا۔ یعنی اس سلسلے میں انھوں نے ان وسائل سے فائدہ نہیں اٹھایا جو پورے برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس موقعے پر "یو پی میں اردو" کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اس کتاب سے مؤلف نے بھرپور استفادہ کیا، اور مؤلف کی بہت سی معلومات کا ماخذ یہی کتاب ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ "یو پی میں اردو" کبھی باقاعدہ کتاب کی صورت میں شایع نہیں ہوئی۔

۱۔ نصیرالدین ہاشمی: "کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات"، جلد اوّل، طبع اوّل، حیدرآباد دکن، خواتین دکنی انسٹیٹیوٹ، ۱۹۶۱ء، ص ۲۴۱۔

یہ ان اقساط کا مجموعہ ہے جو رسالہ "کنول" آگرہ، میں مفتی انتظام اللہ شہابی نے شایع کرانے کے بعد یک جا کر لی تھیں۔ استاد محترم ڈاکٹر نجم الاسلام کے بہ قول جنھوں نے اسے مفتی صاحب کے پاس خود دیکھا تھا، "مفتی صاحب نے ان اقساط کو مذکورہ رسالے کے مختلف شماروں سے الگ کر کے یکجا سی لیا تھا"، یہی وجہ ہے کہ زیر بحث تالیف کے علاوہ کسی اور جگہ اس کتاب کا حوالہ نہیں ملتا، اور جہاں کہیں اس کا ذکر ضروری ہوا، وہاں احتیاطاً اس کتاب کے نام کے ساتھ بریکٹ میں اس کی اصل کیفیت کی صراحت لازمی سمجھی گئی۔[۱] لیکن مؤلف نے اس قسم کی صراحت لازمی نہیں سمجھی، بلکہ خلاف احتیاط اِسے ایک نہایت مستند ماخذ کے طور پر برتا جس کی توقع ایک ادبی مؤرخ سے نہیں کی جا سکتی۔ اسی سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق اپنے تبصرے میں رقم طراز ہیں کہ:

"ابتدائی ابواب میں قابل مؤلف نے دوسروں کی تحقیق پر تکیہ کیا اور اس لیے بعض ایسے امور لکھ گئے جو

۱۔ ڈاکٹر نجم الاسلام: "فضلی کی کربل کتھا"، نقوش، لاہور، شمارہ ۱۱۸، بابت سالنامہ جولائی ۱۹۷۳ء، ص ۶۳ — اس مضمون میں یہ صراحت ملتی ہے۔ اس کے علاوہ خود مفتی انتظام اللہ شہابی نے بھی اپنی خود نوشت میں اس کتاب کا عجیب و غریب نام اس صراحت کے ساتھ استعمال کیا ہے "یو پی میں اردو" خلاصۃ الشعراء، تذکرۂ نثاران سخنوران و مصنفین اکبرآباد (قسط وار شاعر و کنول) ملاحظہ ہو: "مرقع شہابی"، مرتبہ پروفیسر محمد ایوب قادری، کراچی، جناح لٹریری اکیڈمی، ۱۹۷۹ء، ص ۱۶۔

یا تو غلط ہیں یا پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتے"۔۱

اس سلسلے میں انھوں نے ناصر افضلی کے ذکر کی طرف اشارہ کیا، جس میں مؤلف نے مولوی نذر علی درد کاکوروی کے بیان پر تکیہ کرلیا اور اس کی تصدیق نہیں کی، بعد میں معلوم ہوا کہ اس اطلاع کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

(۴)

حامد حسن قادری کی اس تالیف کے اگر تینوں پہلے ایڈیشن سامنے ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تینوں ایک دوسرے سے کسی نہ کسی صورت میں مختلف ہیں اور اس اختلاف کی صورت بھی ہر جگہ مختلف ہے، یعنی ترمیم، اضافے اور حذف تینوں صورتیں دوسرے اور تیسرے ایڈیشن میں موجود ہیں۔ اس طرف خود مولف نے بھی طبع دوم کے دیباچے میں اشارہ کیا ہے۔

> "اب سولہ سال بعد دوسرے ایڈیشن کو مرتب کرتے وقت... میں نے اپنی بعض رائیں بدل دیں، بعض غیر مشہور مصنفوں کو حذف کردیا ہے بعض اقتباسات کو گھٹا دیا، بعض غیر ضروری حواشی کو حذف کر دیا"۔۲

اس موضوع پر مؤلف کی صراحت کے بعد بھی اتنا کہنے کی گنجائش ضرور نکلتی ہے کہ یہ صورتِ حال بہ یک وقت کتاب کی خوبی بھی ہے اور خرابی بھی، خوبی اس صورت میں کہ جب

۱- مولوی عبدالحق : تبصرہ، "اردو" جلد ۲۲، نمبر ۸۵، دھلی، انجمن ترقی اردو (ہند) بابت جنوری ۱۹۴۲ء، ص ۱۴۶۔

۲- حامد حسن قادری : "داستان تاریخ اردو"، طبع دوم، آگرہ، لکشمی نرائن اگروال، ۱۹۵۷ء، ص ۳۔

پہلے ایڈیشن کی اغلاط دوسرے ایڈیشن میں درست کی جائیں اور حواشی میں نئی معلومات دے کر کتاب کو up to date بنایا جائے، اسی طرح یہ سلسلہ آگے تک چلتا رہے، یعنی یہ اختلاف اگر حواشی میں تصحیح اور نئی معلومات کے اضافے تک ہو تو کارآمد بھی ہے اور لفظ ایڈیشن Edition کا عنوان پانے کا مستحق بھی، لیکن ہر مرتبہ نئی طباعت کے موقعے پر اضافے کے ساتھ ساتھ کمی اور معلومات کی حواشی کے بجائے متن میں تبدیلی قاری کے لیے مشکلات کا سبب بھی بن سکتی ہے، یہی حال زیر نظر تالیف کا ہے۔ اس کے تینوں ایڈیشن اگر سامنے ہوں تو اندازہ ہوگا کہ فہرست سے لے کر آخر تک اختلافِ نسخ کی ایک طویل فہرست ہے اور اس کی نوعیت کہیں مثبت ہے اور کہیں منفی، مثلاً فہرست مضامین کی ابتداء ہی کو لیجیے :

طبع اول ، ص ۳	طبع دوم، ص ۱	طبع سوم، ص ۳
آغاز اردو سے پہلے	آغاز اردو سے پہلے	آغاز اردو سے پہلے
عربی اور ہندوستانی الفاظ کا مبادلہ	سنسکرت اور پراکرت	
پنجاب میں اردو	برج بھاشا	
اردو زبان	پنجاب میں اردو کا آغاز	اردو زبان
اردو زبان کی اصل	اردو زبان	
لفظ اردو کی تحقیق	لفظ اردو کی تحقیق	لفظ اردو کی تحقیق
زبان ہندی و کلام ہندوی	زبان ہندی و کلام ہندی	زبان ہندی

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ طبع اول کی فہرست کے مطابق صفحہ ۶، پر "زبان ہندی اور کلام ہندوی" کا کوئی عنوان نہیں

ہے اور طبع دوم صفحہ ۱، پر "سنسکرت اور پراکرت" صفحہ ۲، پر "برج بھاشا" اور صفحہ ۵، پر "زبان ہندی اور کلام ہندوی" کے تحت کوئی باب نہیں ہے۔ اور نہ اس سلسلے میں کوئی صراحت۔ ممکن ہے اس میں کوئی رمز ہو، لیکن بہ ظاہر تو اس میں سوائے عدم توجہی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ صرف فہرستِ مضامین کے ابتدائی حصے کی کیفیت ہے، اس قسم کی صورت حال سے قاری کو کئی مقامات پر دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ، رہا سوال "حک و اصلاح و ترمیم و اضافے" کا تو اس کا مؤلف کو پورا پورا اختیار تھا اور انھوں نے اپنے اس اختیار کو بھرپور طرح استعمال کرکے اس کتاب کو مفید بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ مؤلف کی اس کوشش میں اول، دوم اور سوم ایڈیشنوں میں کچھ اختلافات بھی در آئے، جن میں سے چند ایک کی نشاندھی ڈاکٹر سرور اکبرآبادی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں کی ہے۔۱

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف نے اس کتاب کے سلسلے میں ملنے والی داد و تحسین کے ساتھ تنقید اور تمام مشوروں کا بھی خیرمقدم کیا اور ہر نئی طباعت کے موقعے پر ان سے استفادہ کیا اور حذف و اضافے کے ذریعے کتاب کو مفید سے مفید تر بنانے کی کوشش کرتے رہے، لیکن چند ایک مقامات پھر بھی قلم زد نہیں ہو پائے، مثلاً صفحہ ۲۴، پر اردو کی سب سے پہلی تصنیفِ نثر کے ضمن میں انھوں نے میر نذرعلی درد کاکوروی کے حوالے سے خواجہ سید اشرف جہاں گیر سمنانی کے ایک رسالے کا ذکر کیا ہے اور اس کا

۱۔ ڈاکٹر سرور اکبرآبادی: "حامدحسن قادری"، غیرمطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، شعبۂ اردو، جامعہ سندھ، جام شورو، ص ۲۱۴-۲۰۷۔

زمانۂ تصنیف ۷۰۸ھ/۱۳۰۸ء بتایا ہے، جب کہ اس رسالے کے وجود کے سلسلے میں ارباب تحقیق نے اپنے شبہات کا اظہار بہت پہلے، خود مؤلف اور درد کاکوروی کی زندگی میں ہی کردیا تھا اور دونوں حضرات میں سے کوئی بھی اس سلسلے میں کوئی تسلی بخش دلیل نہیں دے سکا تھا، اس کے باوجود مؤلف نے بغیر کسی صراحت کے، اس ذکر کو شامل اشاعت رکھا، حالانکہ اب تک درد کاکوروی کے علاوہ کوئی اور شخص اس کتاب کو دیکھنے کا دعوےدار نہیں ہے۔

(۵)

ہرچند کہ پہلے ایڈیشن سے لے کر تیسرے ایڈیشن تک اس کتاب میں مسلسل ترمیم و اضافے کا عمل جاری رہا پھر بھی بعض ایسی اغلاط اب بھی شامل اشاعت ہیں جن پر تحقیقی حوالے سے بحث و نظر کی گنجائش ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل تحقیقی اغلاط کی نشان دہی کے لیے زیر بحث کتاب کا تیسرا ایڈیشن پیش نظر رکھا گیا ہے کیوں کہ "حک و اصلاح و ترمیم و اضافے" کا سلسلہ اسی اشاعت تک جاری رہا، اور جہاں کہیں اس سے پہلے کے ایڈیشنوں سے رجوع کیا گیا ہے اس کی وضاحت کردی گئی ہے، چنانچہ اس وضاحت کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل امور ملاحظہ فرمائیے:

مثلاً "آغاز اردو" صفحہ ۱۸، پر مؤلف نے حضرت بابا فرید شکرگنج کے سال ولادت کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کو غلط قرار دے کر "خزینتہ الاصفیا" کے حوالے سے ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء تحریر

کیا ہے، مولوی عبدالحق ۱ نے بابا کا سن ولادت ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء لکھا ہے اور اسی کی تائید ڈاکٹر جمیل جالبی کی تصنیف "تاریخ ادب اردو" ۲ سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگلے صفحے پر مؤلف نے شیخ شرف‌الدین بوعلی قلندر پانی پتی کے ذکر میں ان کا یہ جملہ یوں نقل کیا ہے "ترکا کچھ سمجھدار ہے" جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی ۳ اور مولوی عبدالحق ۴ دونوں حضرات نے اس جملے کو یوں لکھا ہے "ترکا کچھ سمجھ دا ہے" یہ محض کاتب کی غلطی نہیں ہے، اس لیے کہ طبع اول ص ۱۵، اور طبع دوم ص ۱۳، پر بھی یہ غلطی موجود ہے۔

صفحہ ۲۰، پر حضرت امیر خسرو کا سالِ پیدائش مؤلف نے کسی تبصرے کے بغیر ۶۵۳ھ/۱۲۵۵ء لکھا ہے، جب کہ امیر خسرو کے سالِ ولادت کے سلسلے میں مختلف اہل قلم حضرات نے مختلف آراء دی ہیں مثلاً محمد نقی خان خورجوی ۵ اور ابوسلمان شاہ جہاں پوری ۶

۱- مولوی عبدالحق: "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام"، طبع پنجم، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳-

۲- ڈاکٹر جمیل جالبی: "تاریخ ادب اردو"، جلد اول، طبع دوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۴ء، ص ۳۶-

۳- ایضاً، ص ۳۸-

۴- مولوی عبدالحق: "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام"، طبع پنجم، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۶ء، ص ۱۵-

۵- محمد نقی خان خورجوی: "حیات امیرو خسرو"، لاہور، شیخ غلام علی، ص ۳۴-

۶- ابو سلمان شاہ جہاں پوری: "حیاتِ خسرو"، سہ ماہی اردو، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، جلد ۵۱، شمارہ ۴، ۱۹۷۵ء، ص ۲۲۱-

کے مطابق امیر خسرو ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء میں پیدا ہوئے، لیکن محمد محی الدین بدایونی ۱ ڈاکٹر ظہیر فتح پوری ۲ اور ڈاکٹر وحید مرزا ۳ کے بہ قول خسرو ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد مؤلف کا بیان ہے کہ "سلطان غیاث الدین بلبن (خاندان غلاماں) سے سلطان محمد تغلق تک گیارہ شاہان دہلی کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاہوں کی ملازمت کی" جب کہ حقیقت یہ ہے کہ "امیر خسرو نے دہلی کے گیارہ بادشاہوں کا عروج و زوال دیکھا جن میں ۴ خاندان غلاماں، ۵ خاندان خلجی اور ۲ خاندان تغلق سے تعلق رکھتے تھے۔ ۹ درباروں سے وابستہ رہے جن میں چار امراء کے اور پانچ بادشاہوں کے تھے"۔۴

۱۔ محمد محی الدین بدایونی: "حضرت امیر خسرو کی چند تصنیفات"، سہ ماہی اردو، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، جلد ۵۱، ۱۹۷۵ء، ص ۱۴۹۔

۲۔ ڈاکٹر ظہیر فتح پوری: "جدید ہند آریائی زبانوں کے ارتقاٗ میں خسرو کا کردار"، امیر خسرو۔ تنقیدی مضامین، لاہور، نیشنل کمیٹی برائے سات سو سالہ تقریبات امیر خسرو، وفاقی وزارت تعلیم، اسلام آباد، ص ۱۴۔

۳۔ ڈاکٹر وحید مرزا: "امیر خسرو کے حالات زندگی اور تصانیف"، امیر خسرو۔ تنقیدی مضامین، لاہور، نیشنل کمیٹی برائے سات سو سالہ تقریبات امیر خسرو، وفاقی وزارت تعلیم، اسلام آباد، ص ۲۔

۴۔ محمد محی الدین بدایونی: "حضرت امیر خسرو کی چند تصنیفات"، سہ ماہی اردو، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، جلد ۵۱، ۱۹۷۵ء، ص ۱۴۹۔

اسی صفحے پر امیر خسرو کی تصانیف کے بارے میں مؤلف کا بیان ہے کہ "فارسی زبان کے تین دیوان مرتب کیے، اور آٹھ مثنویاں لکھیں۔" جب کہ امیر خسرو کی مسلم تصنیفات کی تفصیل یہ ہے، (۱) "تحفتہ الصغر" (۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء)، (۲) "وسطالحیات" (۶۸۳ھ/۱۲۹۳ء)، (۳) "غرۃالکمال" (۶۹۳ھ/۱۲۹۳ء)، (۴) "بقیہ نقیہ" (۷۱۶ھ/۱۶-۱۳۱۵ء) اور (۵) "نہایت الکمال" (۷۲۴ھ/۱۳۲۴ء)۔ ان دواوین کے علاوہ پانچ تاریخی مثنویاں ہیں (۱) "قرآن السعدین" (۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء)، (۲) "مفتاح الفتوح" (۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء)[1]، (۳) "عشقیہ" یا "دیول رانی و خضر خان" (۷۱۵ھ/۱۳۱۵ء)، (۴) "نہ سپہر" (۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء) اور (۵) "تغلق نامہ" (۷۲۶ھ/۱۳۲۵ء) علاوہ ازیں، پانچ رومانی مثنویاں ہیں جو مجموعی طور پر "پنج گنج" "خمسہ" یا "خمسۂ خسرو" کہلاتی ہیں، ان کے نام یہ ہیں (۱) "مطلع انوار" (۶۹۸ھ/۱۲۹۸ء)، (۲) "شیریں و خسرو" (۶۹۸ھ/۱۲۹۸ء)، (۳) "مجنوں و لیلیٰ" (۶۹۹ھ/۱۲۹۹ء)، (۴) "آئینۂ سکندری" (۶۹۹ھ/۱۲۹۹ء) اور (۵) "ہشت بہشت" (۷۰۱ھ/۱۳۰۱ء)۔ ان کے علاوہ خسرو کی دو منثور تصانیف بھی ہیں (۱) "رسائل الاعجاز" یا "اعجاز خسروی" (۷۱۹ھ/۱۳۱۹ء) اور "خزائن الفتوح" یا "تاریخ علائی" (۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء)۔ اس فہرست میں امیر خسرو کی الحاقی یا مشتبہ تصنیفات و تالیفات شامل نہیں ہیں۔

صفحہ ۲۳، مؤلف نے شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کا ایک دوہا اپنے خاندان کی روایت کے مطابق یوں درج کیا ہے:

۱۔ یہ مثنوی "غرۃالکمال" میں بھی شامل ہے۔

کالا ہنسا نرملے بسے سمندر تیر پنکھ پسارے بس ہرے نرمل کرے سریر

اور مولوی عبدالحق کے درج کردہ دوھے کو نظرانداز کردیا، جب کہ مولوی عبدالحق کے دوھے کی تصدیق " پنجاب میں اردو"[1] سے بھی ہوتی ہے، دوھا یوں ہے:

کالا ہنسا نہ ملا بسے سمندر تیر پنکھ پسارے یکم ہرے نرمل کرے سریر

درد رہے نہ پیڑ

اسی ذیل میں یہ توجہ دلانا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ حضرت شیخ شرف‌الدین یحییٰ منیری کے اردو فالنامے پر ایک عمدہ مضمون ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کا بھی ہے، جو ان کی کتاب "علمی نقوش" میں شامل ہے، اس میں اردو فالنامے کی مختلف قرأتیں درج کی گئی ہیں۔

"نثر اردو کا دور اول" (سلطنت بہمنی) میں صفحہ ۳۸، ۳۹، پر شیخ عین‌الدین گنج‌العلم کے بارے میں مؤلف رقم طراز ہیں:

> "دکن کا سب سے پہلا اردو مصنف شیخ عین‌الدین گنج‌العلم وفات ۷۹۵ھ — ۱۳۹۳ء، ... شیخ صاحب کثیرالتعداد فارسی کتابوں کے مصنف ہیں، دکنی اردو میں بھی چند رسالے مسائل شرعیہ کے متعلق تصنیف فرمائے دکن میں اردو کی سب سے پہلی کتابیں یہی ہیں"

عین‌الدین گنج‌العلم کا ذکر اور لوگوں نے بھی اردو مصنف کی حیثیت سے کیا ہے۔ لیکن اب تک ان کی کوئی اردو تصنیف دستیاب نہیں ہو سکی، اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ:

۱۔ حافظ محمود خان شیرانی: "پنجاب میں اردو"، طبع چہارم، لاہور، مکتبۂ معین الادب، ص ۱۹۶۔

"عین الدین گنج العلم کا نام ہر ادبی تاریخ میں لیا جاتا ہے، لیکن ان کی کوئی دکنی تصنیف اب تک دستیاب نہیں ہوئی، حتیٰ کہ وہ تین رسالے جن کا ذکر شمس اللہ قادری نے 'اردوے قدیم' میں کیا ہے ایک افسانے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے" ۔۱

اسی باب میں مؤلف حامد حسن قادری مزید رقم طراز ہیں کہ "معراج العاشقین' مصنفہ حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسودراز سب سے قدیم ہے" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۳۹) یہ ایک عام مغالطہ ہے کہ "معراج العاشقین" اردو کی اولین نثری تصانیف میں سے ہے اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف ہے، اس کی صراحت ڈاکٹر جمیل جالبی "معراج العاشقین کا مصنف" از ڈاکٹر حفیظ قتیل، مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۶۸ء، ص ۲۹ - ۴۲ کے حوالے سے یوں کرتے ہیں:

"گیسودراز کی تصنیف 'معراج العاشقین' بھی جو اب تک اردو کی پہلی نثری تصنیف مانی جاتی رہی ہے، نہ صرف اس دور کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اس کے مصنف خواجہ گیسو دراز کے بجائے مخدوم شاہ حسینی بیجا پوری ہیں ... اس کی مزید تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ شاہ محمد علی سامانی نے جو بارگاہ خواجہ بندہ نواز کے مرید و خادم تھے 'سیر محمدی' کے نام سے جو تالیف ۸۳۱ھ / ۱۴۲۷ء میں کی تھی

۱- ڈاکٹر جمیل جالبی: "تاریخ ادب اردو"، جلد اول، طبع دوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، سنہ ۱۹۸۴ء، ص ۱۵۹ -

اور جس کے باب پنجم میں بندہ نواز کی ۳۷ تصانیف کا
ذکر کیا ہے، کسی اردو تصنیف کا حوالہ نہیں ملتا "۔۱

اس ضمن میں حیرت کی بات یہ ہے کہ مؤلف نے گیسو دراز کے سلسلے میں ابوالفضائل عبداللہ بن محمد عین‌القضاۃ ہمدانی کی مشہور عربی تصنیف " تمہیدات ہمدانی " کا (جس کی فارسی شرح گیسو دراز نے تین سو سال بعد لکھی اور بعد میں گیسو دراز کی اسی شرح کا دکنی اردو ترجمہ میراں جی حسن خدانما نے ۱۰۶۶ھ میں کیا) ذکر نہیں کیا حالانکہ یہ کتاب اپنے زمانے سے لے کر آج تک صوفیائے کرام اور اہل علم حضرات میں بےحد مقبول ہے۔ عادل شاہی عہد کے شمس العشاق میران جی کے ذکر میں مؤلف کا بیان ہے کہ " ان کی تمام تصانیف اردو نثر یا نظم میں ہیں، تصانیف نثر میں سے ' شرح مرغوب القلوب ' 'جل ترنگ' اور ' گل باس' قلمی موجود ہیں" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۴۲)۔

پھر صفحہ ۴۴، پر قطب شاہی عہد میں شاہ میراں جی خدانما کے باب میں ان کے رسالے کا نام مؤلف نے " شرح تمہید ہمدانی " لکھا ہے، مؤلف کے علاوہ ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو نے بھی اپنے ایک تحقیقی مضمون " تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ" میں اس رسالے کا یہی نام لکھا ہے ۲ لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے اسی رسالے

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: " تاریخ ادب اردو"، جلد اول، طبع دوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۴ء، ص ۶۰—۱۵۹۔

۲۔ ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو: " تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ"، ادبی دنیا، لاہور، بابت دسمبر ۱۹۴۰ء، ص ۱۴۔

کا نام "شرح تمہیداتِ ہمدانی"۔۱ لکھا ہے۔ نیز سالِ وفات، مؤلف نے بیلی کے حوالے سے ۱۰۷۰ھ / ۱۶۵۹ء اور مولوی عبدالحق کے حوالے سے ۱۰۷۴ھ / ۱۶۶۳ء لکھا ہے، اور دونوں سنین میں سے کسی ایک سے اتفاق یا اختلاف ظاہر نہیں کیا اور نہ یہ وضاحت ہی کی کہ مولوی عبدالحق نے مذکورہ سالِ وفات کہاں لکھا ہے، ویسے درست سالِ وفات وہی ہے جو مولوی عبدالحق ۲ نے بیان کیا ہے۔ کیوں کہ مولوی عبدالحق نے اس کو اپنے مجموعۂ مقالات "قدیم اردو" کے ایک مقالے میں قابلِ ترجیح قرار دیا ہے، اور ڈاکٹر جمیل جالبی ۳ نے بھی اسی سن کو ایک دلیل کے ساتھ اختیار کیا ہے۔

صفحہ ۴۵، پر مؤلف نے ملا وجہی کے سلسلے میں صرف "سب رس" کا ذکر کیا ہے اور "قطب مشتری" ۱۰۱۸ھ / ۱۶۰۹ء کو نظرانداز کر دیا۔ ہرچند کہ "قطب مشتری" شعری تصنیف ہے اور کتاب کے موضوع سے براہ راست تعلق نہیں رکھتی، لیکن چوں کہ حامدحسن قادری نے دیگر نثر نگاروں کے ذکر میں یہ التزام بھی کیا ہے کہ ان کے نثری کارناموں کے ذیل میں شعری تصانیف کا بھی ذکر کیا جائے، اس لیے بہتر ہوتا کہ وجہی کے ذکر کو مکمل کرنے کے لیے ان کے اس شعری کارنامے کا بھی ذکر کیا جاتا۔

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: "تاریخ ادبِ اردو"، جلد اول، طبع دوم، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۸۴ء، ص ۴۹۹۔

۲۔ مولوی عبدالحق: "قدیم اردو"، طبع اول، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۱ء، ص ۲۰۸۔

۳۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: "تاریخ ادب اردو"، جلد اول، طبع دوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۴ء، ص ۴۹۷۔

اسی باب میں صفحہ ۴۷، پر میراں یعقوب کے ذکر میں مؤلف کا بیان ہے کہ "ایک ضخیم کتاب 'شمائل الاتقیاء' مصنفہ شیخ برہان الدین اورنگ آبادی کو میراں یعقوب نے ۱۰۷۸ھ/ ۱۶۶۷ء کے بعد اردو میں ترجمہ کیا" جب کہ حقیقت یہ ہے کہ "شمائل الاتقیاء' رکن عمادالدین دبیر معنوی کی تصنیف تھی، جو شاہ برہان الدین غریب کے مرید اور اپنے وقت کے جید عالم . . . تھے"-۱ اور اس کا ترجمہ ۱۰۸۳ھ/ ۱۶۷۳ء میں مکمل ہوا- آگے چل کر (دکن بہ عہد مغلیہ) میں مترجم طوطی نامہ قادری کے سلسلے میں مؤلف کا بیان ہے کہ:

> "اس شخص کا نام معلوم نہ ہو سکا . . . 'طوطی نامہ' بھی دراصل سنسکرت میں لکھا گیا تھا- جس میں طوطے کی زبانی ستر کہانیاں کہی گئی تھیں- مولانا ضیاءالدین نخشبی بدایونی متوفی، ۷۵۱ھ/ ۱۳۵۰ء نے ان ستر کہانیوں میں سے باون کا انتخاب کر کے ۷۳۰ھ/ ۱۳۳۰ء میں فارسی میں لکھا اور 'طوطی نامہ' نام رکھا . . . ملا سید محمد قادری نے گیارھویں صدی ہجری میں ان باون کہانیوں میں سے پینتیس کہانیوں کو عمدہ اور بامحاورہ فارسی میں لکھا اور 'طوطی نامہ' ہی نام رکھا-" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۵۰)

نخشبی کی ان منتخب کہانیوں کی تعداد اور سن تالیف نیز ملا سید محمد قادری (جن کا پورا نام بہ قول مؤلف، معلوم نہ ہو سکا اور بہ قول ڈاکٹر گیان چند جین سید محمد خداوند قادری ہے) کے

۱- ڈاکٹر جمیل جالبی: "تاریخ ادب اردو"، جلد اول، طبع دوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء، ص ۵۰۱-

انتخاب کی تعداد اور سنِ تالیف کے بارے میں مختلف ماہرین نے مختلف رائے دی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں:

"طوطی نامہ" (۱۰۴۹ھ/ ۱۶۳۹ء) ضیاء الدین نخشبی کی نثری تصنیف (۷۳۰ھ/ ۱۳۲۹ء) 'طوطی نامہ' سے ماخوذ ہے۔ 'طوطی نامہ' کا اصل ماخذ سنسکرت زبان کی ایک کتاب 'شکاسب تتی' ہے جس میں طوطے کی زبان سے ستر کہانیاں کہلوائی گئی ہیں۔ نخشبی نے 'طوطی نامہ' کو سامنے رکھ کر جس میں بارہ کہانیاں لکھی گئی ہیں . . . بعد میں ملا قادری نے ۱۰۷۳ھ/ ۱۶۶۲ء میں آسان فارسی میں . . . لکھا"۔۱

اسی موضوع پر رام بابو سکسینہ اپنی تالیف میں رقم طراز ہیں:

"اصل میں یہ قصہ سنسکرت میں 'شوکا شپتتی' کے نام سے تھا، فارسی میں اس نام کی ایک کتاب جو باون قصوں پر مشتمل تھی۔ ضیاے بخشی [صحیح ضیاءالدین نخشبی] نے ۱۲۳۰ھ میں لکھی تھی، جس سے دوسرا 'طوطی نامہ' پینتیس قصص کا سید محمد قادری نے ۹۴—۱۷۹۳ء میں مختصر اور صاف کر کے ترتیب دیا ہے"۔۲

اور ڈاکٹر گیان چند جین اسی مسئلے کی صراحت اپنے تحقیقی مقالے

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: "تاریخ ادب اردو"، جلد اول، طبع دوم، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۸۴ء، ص ۴۸۱۔

۲۔ رام بابو سکسینہ: "تاریخ ادب اردو" (مترجم مرزا محمد عسکری) لاہور، علمی کتاب خانہ، جدید ایڈیشن، ۱۹۸۱ء، ص ۳۶۸۔

" اردو کی نثری داستانیں" میں یوں کرتے ھیں:

" نخشبی نے کچھ حکایتیں مختلف ماخذوں سے لے کر شامل کی ھیں، نخشبی کے 'طوطی نامے' میں بھی باون کہانیاں ھیں جن میں سے چند کی اصل سنسکرت 'شک سپتتی' تک پہنچتی ھے ... فارسی کا چوتھا 'طوطی نامہ' سید محمد خداوند قادری کا ھے، قادری نے نخشبی کے یہاں سے محض پینتالیس کہانیاں لے کر انھیں سلیس و سادہ فارسی میں لکھا "-۱

ڈاکٹر گیان چند جین نے " اردو مثنویاں" از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے حوالے سے اس کا سنِ تالیف ۱۰۹۳ھ درج کیا ھے اور اسی کو درست قرار دیتے ھوئے سکسینہ کے درج کردہ سن یعنی ۱۷۹۳ء کو صریحاً غلط کہا ھے۔

صفحہ ۵۳، ۵۴ پرمحمد باقر آگاہ کے ذکر میں مؤلف کا بیان ھے کہ "انھوں نے ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء میں اور اس کے بعد متعدد کتابیں عقائد و فقہ کے متعلق اردو میں لکھیں۔" لیکن اس سلسلے میں مؤلف نے آگاہ کی کسی تصنیف کا نام نہیں لیا، حتیٰ کہ " دکن میں اردو" کے حوالے سے جو اقتباس نقل کیا ھے، اس کے بارے میں بھی یہ وضاحت نہیں کی کہ اس کا تعلق آگاہ کی کس تصنیف سے ھے۔ ویسے آگاہ کی جو تصانیف اب تک زندہ ھیں ان میں " گل رازِ عشق" ۱۲۱۰-۱۱ھ، "غرقابِ عشق"، "ھشت بہشت"، " محبوب القلوب" اور "ریاض الجنان" قابلِ ذکر ھیں۔

۱۔ ڈاکٹر گیان چند جین : " اردو کی نثری داستانیں"، طبع دوم، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۶۹ء، ص ۳۱۶ -

اس کے بعد صفحہ ۵۷ پر "نثر اردو کا دوسرا دور" (شمالی ہند میں) کے تحت مؤلف فضلی کی "کربل کتھا" کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ "ملا واعظ حسین کاشفی کی فارسی کتاب 'روضتہ الشہداء' کا ترجمہ ہے"۔ جب کہ اس سلسلے میں حقیقت یہ ہے کہ فضلی کی "کربل کتھا" کاشفی کی "روضتہ الشہداء" کے کسی خلاصے کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے بعد اگلے صفحے پر "تذکرۂ شعرائے ہند" سے اس کتاب کی عبارت کے مختلف حصے "دیباچہ" کہہ کر نقل کیے ہیں، اس سلسلے یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مؤلف اس کتاب کے صحیح نام کے بارے میں کوئی واضح تاثر نہیں رکھتے، کیوں کہ اس کے لیے انھوں نے "دہ مجلس" یا "کربل کتھا" کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جب کہ "تذکرۂ شعرائے ہند" سے عبارت کے مختلف حصے نقل کرتے ہوئے ایک جگہ یہ جملہ درج کیا ہے: "یہ رسالۂ مسعود اوپر بارہ مجلس اور ایک خاتمے کے ہے" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۵۸) اس جملے میں جب یہ صراحت موجود ہے کہ اس رسالے میں دس سے زاید مجالس ہیں تو پھر "دہ مجلس" کا عنوان تو خود بہ خود خارج از بحث ہوجاتا ہے۔ مزید یہ کہ اس باب میں مؤلف کی معلومات خاصی پرانی ہیں جن کی جدید تحقیق سے تصدیق بھی نہیں ہوتی، تاہم اب اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ڈاکٹر نجم الاسلام کا پُر از معلومات تحقیقی مضمون "فضلی کی کربل کتھا"[۱] کافی اہمیت رکھتا ہے۔

اسی باب میں صفحہ ۶۲ پر مؤلف نے سودا کا پورا نام "مرزا

۱۔ ڈاکٹر نجم الاسلام: "فضلی کی کربل کتھا"، نقوش، لاہور، شمارہ ۱۱۸، بابت سال نامہ جولائی ۳-۱۹۶۲ء، ص ۵۵۔

رفیع سودا دھلوی" لکھا ھے، جب کہ میر تقی میر ۱ کے علاوہ تقریباً سب ھی لوگوں نے مثلاً آزاد ۲ اور فتح علی گردیزی ۳ وغیرہ نے مرزا محمد رفیع لکھا ھے اور اسی نام کو ڈاکٹر خلیق انجم ۴ نے درست قرار دیا ھے۔ اس کے بعد مؤلف نے سودا کا سالِ ولادت "۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء" لکھا ھے، جب کہ سودا کا سالِ ولادت شیخ چاند ۵ نے ۱۱۰۶ھ لکھا ھے جو کہ بعد کی تحقیق سے غلط ثابت ھو جاتا ھے، شیخ چاند کے بعد محمد حسن کا بیان ھے کہ "سودا، غالباً ۱۱۱۵ھ/۱۱۱۸ھ کی درمیانی مدت میں پیدا ھوئے"۔۶ لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک طویل اور مدلل بحث کے ذریعے داخلی اور خارجی شواھد کی مدد سے ۱۱۱۸ھ/ ۷-۱۶۰۶ء، ۷ کو درست

۱۔ میر تقی میر: "نکات الشعراء"، طبع دوم، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۷۹ء، ص ۳۱۔

۲۔ محمد حسین آزاد: "آبِ حیات"، طبع شانزدھم، لاھور، شیخ مبارک علی، ۱۹۵۴ء، ص ۱۸۴۔

۳۔ سید فتح علی حسینی گردیزی: "تذکرہ ریختہ گویاں"، مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد (دکن)، انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۳۳ء، ص ۶۷۔

۴۔ ڈاکٹر خلیق انجم: "مرزا محمد رفیع سودا"، طبع اول، علی گڑھ، انجمن ترقیٔ اردو (ھند)، ۱۹۶۶ء، ص ۶۶۔

۵۔ شیخ چاند: "سودا"، طبع دوم، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۶۳ء، ص ۴۷۔

۶۔ سودا: "کلیاتِ سودا"، مرتبہ محمد حسن، طبع اول، دھلی، ترقیٔ اردو بورڈ، ۱۹۸۵ء، ص ۵۰۔

۷۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: "تاریخِ ادب اردو"، جلد دوم (حصہ دوم) طبع اول، لاھور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۸۲ء، ص ۶۵۳۔

سالِ ولادت قرار دیا ہے اور ڈاکٹر خلیق انجم ۱ بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔

اس کے بعد صفحہ ۶۳ پر شاہ رفیع الدین کے ذکر میں مؤلف کا بیان ہے کہ "سودا کے دیباچے تک شمالی ہند کی کوئی مستقل و مکمل تصنیفِ نثر معلوم و متعارف نہیں ہے، اس حساب سے سب سے پہلی نثر کی کتاب شاہ رفیع‌الدین صاحب کا ترجمۂ قرآن ہے" اور اس ترجمے کا سنِ تصنیف مؤلف نے ایک جگہ ۱۲۰۰ھ کے قریب قریب اور ایک جگہ "موضح قرآن" (سال اتمام ۱۲۰۵ھ) سے دو تین سال پہلے بتایا ہے، ہو سکتا ہے کہ مؤلف کا یہ بیان اس وقت کی معلومات کی روشنی میں درست ہو، لیکن جدید تحقیق کے مطابق شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی کی تفسیر پارۂ عم (۱۱۸۵ھ) "اس سے کہیں پرانی ہے"-۲ اس کی روشنی میں تقدم کی فضیلت شاہ رفیع الدین کے ترجمۂ قرآن کو نہیں جاتی بلکہ "تفسیر مرادیہ" کے حصے میں آتی ہے۔

اس کے بعد مؤلف صفحہ ۶۴ پر مزید رقم طراز ہیں کہ "شاہ رفیع الدین صاحب نے اردو کا ترجمہ ۱۲۰۰ھ ۱۷۷۶ء کے قریب قریب کیا"۔ جب کہ ۱۲۰۰ھ کی مطابقت ۸۶-۱۷۸۵ء سے ہے نہ کہ ۱۷۷۶ء سے، اور یہ غلطی طبع اول ص ۵۵ اور طبع دوم ص ۵۴ پر بھی موجود ہے۔

۱۔ ڈاکٹر خلیق انجم: "مرزا محمد رفیع سودا"، طبع اول، علی گڑھ، انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، ۱۹۶۶ء، ص ۷۲۔

۲۔ ڈاکٹر نجم الاسلام: "تین نثری نوادر"، نقوش، لاہور، شمارہ ۱۰۵، بابت ۱۹۶۶ء، ص ۱۵۰۔

اسی باب میں صفحہ ۶۷ پر میر حسین عطا خاں تحسین کے ذکر میں مؤلف کا بیان ہے کہ تحسین نے "نو طرزِ مرصع" کی تصنیف جنرل اسمتھ کی ملازمت کے زمانے میں شروع کردی تھی۔ لیکن شجاع الدولہ کے دربار میں آ کر ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء میں ختم کی"۔ "نو طرزِ مرصع" کے سنِ تالیف سے متعلق یہ ایک بڑا مغالطہ ہے، جس کی ابتداء "آبِ حیات" سے ہوتی ہے جس کے مطابق:

> "میر محمد حسین [عطا] خاں تحسین نے 'چار درویش' کا قصہ اردو میں لکھ کر 'نو طرزِ مرصع' نام رکھا۔ شجاع الدولہ کے عہد میں تصنیف شروع ہوئی۔ ۱۲۱۳ھ/ ۱۷۹۸ء میں نواب آصف الدولہ کے عہد میں ختم ہوئی"۔۱

لیکن مؤلف کے بیان کا ماخذ مولوی عبدالحق کا وہ دیباچہ ہے جو انھوں نے میر امن دہلوی کی "باغ و بہار" پر لکھا ہے، جس کے مطابق "نو طرز مرصع" کا سنہ تالیف ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء ہے، جب کہ ڈاکٹر گیان چند جین کے بہ قول "نوطرز مرصع" کی داغ بیل ۱۷۶۸ء میں پڑ چکی تھی۔ تکمیل ۱۷۷۵ء میں ہوئی ہوگی"۔۲ اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے بھی تمام داخلی اور خارجی شواہد کو مدِ نظر رکھ کر یہی نتیجہ نکالا ہے کہ تحسین کی "نو طرز مرصع":

> "۱۷۶۸ء سے شروع ہوکر ۱۷۷۵ء میں تمام ہوئی اور دو ایک سال میں کچھ عبارتیں اور مدحیہ قصیدے میں

۱۔ محمد حسین آزاد: "آبِ حیات"، طبع شانزدھم، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۵۴ء، ص ۲۵۔

۲۔ ڈاکٹر گیان چند جین: "اردو کی نثری داستانیں"، طبع دوم، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۶۹ء، ص ۱۴۳۔

شجاع الدولہ کے بجائے آصف الدولہ کا نام لکھ کر ان
کے حضور میں پیش کردی گئی ہوگی"۔۱

ورنہ ۱۷۹۸ء میں خود شجاع الدولہ تو کیا، ان کے خلف اور جانشین آصف الدولہ بھی فوت ہو چکے تھے۔

صفحہ ۸۳ پر مؤلف کا بیان ہے کہ "ہیڈلے نے ۱۷۷۲ء میں اردو کی گرامر (صرف و نحو) لکھی" جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ "ہیڈلے کی گرامر کا پہلا ایڈیشن ۱۷۷۰ء میں اور دوسرا ۱۷۷۲ء میں شایع ہوا"۔۲

صفحہ ۸۴ پر گل کرسٹ کے بارے میں مؤلف کا بیان ہے کہ "۱۲۱۴ھ/ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ اس کے پرنسپل ڈاکٹر گل کرائسٹ [کرسٹ] مقرر ہوئے"۔ اس سلسلے میں محمد عتیق صدیقی اپنی تالیف "گل کرسٹ اور اس کا عہد" میں کلکتہ گزٹ کی فائل میں ۲۹ ستمبر ۱۸۰۰ء کے ایک غیر معمولی شمارے کے حوالے سے گل کرسٹ کا ذکر ہندوستانی زبان کے پروفیسر کی حیثیت سے کرتے ہیں، کیوں کہ اسی گزٹ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کالج کے انتظامی امور کو سرانجام دینے کے لیے گورنر جنرل نے ایک کونسل بنائی تھی جس میں "پادری

۱۔ میر محمد حسین عطا خاں تحسین: "نو طرزِ مرصع"، مرتبہ نورالحسن ہاشمی، طبع اول، الہ آباد، ہندوستانی اکیڈمی، ۱۹۵۸ء، ص ۳۲۔

۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: "تاریخِ ادب اردو"، جلد دوم (حصہ دوم)، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۸۲ء، ص ۱۰۶۵۔

ڈیوڈ براؤن پرووسٹ (پرنسپل)"-۱ کی حیثیت رکھتے تھے۔ مؤلف مزید رقم طراز ھیں کہ "۱۸۴۱ء میں یہ مقام پیرس ڈاکٹر صاحب نے ۸۲ برس کی عمر میں انتقال کیا" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۸۵)۔ جب کہ عتیق صدیقی کے مطابق "جان بارتھ وک گل کرسٹ (۱۷۵۹ء تا ۱۸۴۸ء)"-۲ یعنی گل کرسٹ ۱۷۵۹ء کو ایڈنبرا میں پیدا ھوئے اور ۱۸۴۸ء میں ۸۹ برس کی عمر پاکر فوت ھوئے۔

صفحہ ۸۶ پر مؤلف ولیم ٹیٹ کی ایک کتاب "مقدمۂ زبان ھندوستانی" (مطبوعہ کلکتہ) کا سنِ اشاعت ۱۹۲۷ء بتاتے ھیں یہ صریحاً سہو کتابت کے ذیل میں آتا ھے، کیوں کہ قادری صاحب نے اس کتاب کا ذکر بیسویں صدی کے حوالے سے نہیں کیا، ویسے یہ کتاب "پہلی، دوسری اور تیسری بار، بالترتیب ۱۸۲۴ء، ۱۸۲۷ء اور ۱۸۳۳ء میں شائع ھوئی"-۳

صفحہ ۸۷ پر مؤلف نے اسٹیفورڈ ارناٹ کو اسٹیم فورڈ ارناٹ لکھا ھے۔ یہ بھی سہو کتابت ھو سکتا ھے۔

صفحہ ۸۸ پر مؤلف نے گارسیں دتاسی کی ان کتابوں کے نام گنائے ھیں جن کا تعلق اردو سے ھے۔ سترہ کتابوں کے ذکر پر مشتمل اس فہرست میں انھوں نے "تاریخ ادب ھندستانی" مرقومہ ۱۸۳۹ء

۱- محمد عتیق صدیقی: "گل کرسٹ اور اس کا عہد"، طبع دوم، نئی دھلی، انجمن ترقیٔ اردو (ھند)، ۱۹۷۹ء، ص ۱۱۶-۱۱۵-

۲- ایضاً، ص ۳۷-

۳- ڈاکٹر مس رضیہ نور محمد: "اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ"، طبع اول، لاھور، مکتبۂ خیابان ادب، ۱۹۸۵ء، ص ۱۲۵-

(بزبان فرانسیسی) کو نظر انداز کردیا۔ اور بقیہ کتابوں میں سے بھی بعض کا نام اور بعض کا سنہ تالیف غلط لکھا ہے، مثلاً "مثنوی کامروپ" کا سنہ تالیف بہ قول ڈاکٹر مس رضیہ نور محمد "۱۸۳۴ء" [۱] ہے، جب کہ مؤلف نے ۱۸۲۴ء لکھا ہے، اور "کلیات ولی" ۱۸۳۴ء کو مؤلف نے "انتخاب کلام ولی اورنگ آبادی، مطبوعہ ۱۸۳۶ء" لکھا ہے۔

صفحہ ۸۷ پر مؤلف کا بیان ہے کہ "ایف فیلن نے مولوی کریم الدین دہلوی کی شرکت میں شاعروں کا تذکرہ شعرائے ہند کے نام سے مرتب کیا (مطبوعہ ۱۸۴۸ء)" واضح رہے کہ اس تذکرے کا صحیح نام "طبقات الشعرائے ہند" ہے، خود مؤلف حامد حسن قادری نے بھی صفحہ ۸۹، پر اس تذکرے کا صحیح نام، سال تالیف کی غلطی کے ساتھ یوں لکھا ہے:

> "مسٹر فیلن اور مولوی کریم الدین دہلوی نے باہمی شرکت اور معاونت سے شعرائے ہند کا تذکرہ 'طبقات الشعرائے ہند' کے نام سے مرتب کیا... ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء میں یہ تالیف ختم ہوئی۔" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۸۹)۔
>
> جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تذکرہ "۱۲۳۶ھ/۱۸۴۷ء میں مکمل ہوا" [۲]۔

۱۔ ڈاکٹر مس رضیہ نور محمد: "اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ"، طبع اول، لاہور، مکتبۂ خیابان ادب، ۱۹۸۵ء، ص ۱۹۵۔

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری"، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۷۲ء، ص ۳۵۹۔

مؤلف انجیل کے ترجموں کا ذکر ہوئے کرتے ڈاکٹر میتھر کے ترجمے کے بارے میں اس کے ٹائٹل پیج کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ " نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی کی طرف سے مرزا پور کے آرفن اسکول پریس میں ڈاکٹر میتھر صاحب کے اہتمام سے ۱۸۶۷ء میں چھاپی گئی"۔ (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۹۱) ڈاکٹر رضیہ نور محمد کے مقالے میں ڈاکٹر آر سی میتھر کے جس ترجمے کا ذکر ملتا ہے، وہ "۱۸۷۰ء"[۱] میں شایع ہوا، اس کے علاوہ ڈاکٹر رضیہ نے اپنے مقالے میں ڈاکٹر میتھر کے حوالے سے کسی اور ترجمے کا ذکر نہیں کیا۔ صفحہ ۹۲ پر مؤلف گراہم بیلی کی تالیف کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ " نمونہ نثر و نظم کچھ نہیں ہے۔ بعض جگہ غلطیاں بھی کی ہیں، لیکن کتاب کی ترتیب واضح و دلچسپ ہے... الخ" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۹۲) تاہم اس سلسلے میں مؤلف نے کسی غلطی کی نشان دھی نہیں کی۔

" نثر کا تیسرا دور" (مصنفین فورٹ ولیم کالج) کے حوالے سے کالج کی سرسری تاریخ بیان کرنے کے بعد مؤلف رقم طراز ہیں کہ " ڈاکٹر گل کرسٹ اس کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۹۶) یہ غلطی مؤلف پچھلے صفحات میں بھی کر چکے ہیں، وہاں بھی اس کی تردید کی جا چکی ہے اور یہاں بھی کی جا رہی ہے کہ "فورٹ ولیم کالج میں گل کرسٹ کی حیثیت صرف 'ہندستانی پروفیسر' کی تھی اور کالج سے مستعفی ہونے تک

۱۔ ڈاکٹر مس رضیہ نور محمد: " اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ"، طبع اول، لاہور، مکتبۂ خیابان ادب، ۱۹۸۵ء، ص ۲۱۷۔

وہ اسی عہدے پر مامور رہا"۔۱ گل کرسٹ کو کالج کا پرنسپل صرف انھی لوگوں نے لکھا ہے جن کی رسائی فورٹ ولیم کالج کی ان ابتدائی مطبوعات تک نہ ہو سکی جو اس کی پروفیسری ہی کے عہد میں شایع ہوئی تھیں اور جن کے سرورق پر مصنف یا نگراں کی حیثیت سے اس کا نام بھی درج ہے، یہی بات خود گل کرسٹ کی ان تالیفات کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے جو اس نے وطن واپس جانے کے بعد انگلستان سے شایع کی تھیں۔ ویسے اس مضحکہ خیز غلطی سے انگریزی کی مستند ترین کتابیں مثلاً "ڈکشنری آف نیشنل بایو گرافی"، "میڈیکل آفیسرز آف انڈین آرمی"، "انسائیکلو پیڈیا برٹنے نیکا"، اور "ڈکشنری آف انڈین بایوگرافی" وغیرہ بھی پاک نہیں ہیں۔

اس کے بعد میر امن دھلوی کے ذکر میں مؤلف رقم طراز ہیں کہ:

"باغ و بہار، ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں لکھنی شروع کی اور ۱۲۱۷ھ/۱۸۲۰ء [صحیح ۱۸۰۲ء] میں ختم کی - ۱۸۰۳ء میں پہلی بار طبع ہوئی 'باغ و بہار' تاریخی نام ہے (۱۲۱۷ھ سنہ نکلتا ہے)"۔ (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۱۰۱) حامد حسن قادری کا استدلال اس وقت کی معلومات کے عین مطابق ہے، ۱۲۱۷ھ کی مطابقت کی غلطی بھی سہو کاتب ہے کیوں کہ طبع اول، ص ۹۰ اور طبع دوم، ص۸۶ پر مطابقت ٹھیک درج ہے یہ غلطی صرف طبع سوم میں ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ بعد کی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ:

۱۔ محمد عتیق صدیقی: "گل کرسٹ اور اس کا عہد"، طبع دوم، نئی دھلی، انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، ۱۹۷۹ء، ص ۲۳۔

"۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء کو 'چار درویش' ہر کارہ پریس میں، فارسی رسم الخط میں چھپ رہی تھی، اور اس تاریخ تک اس کے ۵۸ صفحات چھپ چکے تھے، اس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۸۰۱ء کے اواخر میں کتاب مکمل ہو چکی تھی ... آگے چل کر بعض وجوہ کی بنا پر ... اور کتابوں کے ساتھ 'چار درویش' کی اشاعت بھی روک دی گئی اور یہ طے پایا کہ زیرِ طبع کتابوں کے جتنے اجزا چھپ چکے ہیں، ان کو یک جا کر کے انتخاب کی شکل دے دی جائے، چناں چہ یہ انتخابی مجموعہ 'ہندی مینول' کے نام سے ۱۸۰۲ء میں شایع ہوا، اس میں 'چار درویش' کے ۱۰۲ صفحات بھی شامل تھے"۔۱

میر امن کی دوسری تصنیف "گنج خوبی" کے بارے میں مؤلف کا بیان ہے کہ "ڈاکٹر صاحب (گل کرسٹ) نے اس کو چھپوایا بھی نہیں" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۱۰۴) جب کہ محمد عتیق صدیقی نے اپنی تصنیف "گل کرسٹ اور اس کا عہد" میں گل کرسٹ کے عہد کی تصنیفات و تالیفات کے ذیل میں مطبوعہ اور زیر طبع کتابوں کی ایک فہرست دی ہے جس میں بیسویں نمبر پر "اخلاق محسنی" (گنج خوبی) ۲ کا نام مطبوعہ کتب کی فہرست میں شامل ہے۔

۱۔ محمد عتیق صدیقی: "گل کرسٹ اور اس کا عہد"، طبع دوم، نئی دہلی، انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، ۱۹۷۹ء، ص ۱۳۲۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۷۳۔

اس کے بعد حیدر بخش حیدری کے ذکر میں "آرائش محفل" کا سالِ تکمیل "۱۲۱۶ھ/۱۸۰۲ع" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۱۰۹) لکھا ہے جب کہ گل کرسٹ کی فہرست کے مطابق ۹ اگست ۱۸۰۳ع کو یہ کتاب زیر طبع تھی - ۱

صفحہ ۱۱۴ میر شیر علی افسوس کے بارے میں مؤلف کا بیان ہے کہ "۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ع عمدۃ الملک کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ افسوس کے چچا سید غلام علی خاں، الہ آباد کے صوبے دار مقرر ہوئے"۔ جب کہ اس سلسلے میں کلب علی خاں فائق کا بیان ہے کہ "عمدۃ الملک کا عروج حد سے تجاوز کر گیا تھا اِس لیے محمد شاہ کے ایماء سے ۲۳ ذی حجہ ۱۱۵۹ھ کو دیوان خاص میں اُسے قتل کر دیا گیا" - ۲ اس وضاحت کے بعد کلب علی خاں فائق نے خود افسوس کا بیان نقل کیا ہے، جس سے بہ خوبی واضح ہو جاتا ہے کہ "عمدۃ الملک کے واقعے کے بعد با لذات سید غلام علی خاں نائب صوبےدار الہ آباد کے رہے" - ۳ واضح رہے کہ اس بیان کی تائید بھی دیگر تاریخی کتابوں سے نہیں ہو سکی، لیکن کلب علی خاں فائق کے خیال میں وہ الہ آباد میں اہم خدمت پر مامور ہوئے ہوں گے۔

اس کے بعد مؤلف مزید رقم طراز ہیں کہ "سرفرازالدولہ نے لکھنؤ کے ریزیڈنٹ کرنل سے افسوس کی سفارش کر کے کلکتہ بھجوادیا۔

۱- محمد عتیق صدیقی: "گل کرسٹ اور اس کا عہد"، طبع دوم، نئی دھلی، انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، ۱۹۷۹ء، ص ۱۷۳ -

۲- میر شیر علی افسوس: "آرائشِ محفل"، مقدمہ از کلب علی خاں فائق، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۶۳ع، ص ۳-

۳- ایضاً، ص ۳-

وہاں ۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۱ء میں پہنچے" (داستان تاریخ اردو ، طبع سوم ، ص ۱۱۴) حال آں کہ جدید تحقیق کے مطابق فورٹ ولیم کالج میں مترجم کی حیثیت سے افسوس کا تقرر بروز جمعہ ۱۷ ، اکتوبر ۱۸۰۰ء کو ہوا ، اور "دسمبر ۱۸۰۰ء میں افسوس کلکتہ پہنچ گئے"۔ ۱ خود مؤلف نے بھی اس بات کی تائید اپنے ایک حاشیے مشمولہ طبع سوم ، ص ۱۱۶ میں کی ہے۔

صفحہ ۱۲۳ پر مؤلف کا بیان ہے کہ "لطف نے ۱۲۳۸ھ /۱۸۲۶ء میں انتقال کیا" ہر چند کہ مؤلف کے اس بیان کی تائید "ارباب نثر اردو" ۲ اور "بنگال کا اردو ادب" ۳ سے بھی ہوتی ہے لیکن ڈاکٹر فرمان فتح‌پوری کے مطابق لطف کا سال وفات ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ء ہے۔۴ نیز اسی صفحے پر مؤلف مزید لکھتے ہیں کہ "سرب سنگھ جن کا تخلص دیوانہ ہے" جب کہ دیوانہ کا صحیح اور پورا نام رائے سرب

۱۔ میر شیر علی افسوس : "آرائش محفل" ، مقدمہ از کلب علی خاں فائق ، طبع اول ، لاہور ، مجلس ترقیٔ ادب ، ۱۹۶۳ء ، ص ۳۱۔

۲۔ مولوی سید محمد : "ارباب نثر اردو"، طبع دوم، حیدرآباد (دکن)، مکتبۂ ابراہیمیہ ، ۱۹۳۷ع ، ص۱۳۶ -

۳۔ ڈاکٹر جاوید نہال : " بنگال کا اردو ادب"، طبع دوم ، کلکتہ ، عثمانیہ بک ڈپو ، ۱۹۸۱ء ، ص ۲۰۸ -

۴۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری : "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" ، طبع اول ، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب ، ۱۹۷۲ء ، ص ۲۱۰ -

سکھ ۱ ہے۔ اس کے بعد مظہر علی خاں ولا کے بارے میں مؤلف کا بیان ہے کہ "ان کا نام مرزا لطف علی تھا لیکن مظہر علی خاں کے نام سے مشہور ہیں" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۱۲۸) جب کہ اس سلسلے میں صحیح صورت حال یہ ہے کہ ولا کے نام کے بارے میں اختلاف ہے مثلاً نادم سیتا پوری کا بیان ہے "اصلی نام مرزا لطف علی تھا لیکن شہرت مظہر علی خاں کی عرفیت سے پائی"۲ اور ڈاکٹر جاوید نہال کے مطابق "مظہر علی خاں کا نام مرزا لطف (کذا) بھی تھا، مگر وہ مظہر علی خاں کے نام ہی سے مشہور ہوئے"۳ اور قدرت‌اللہ قاسم کے بہ قول "ولا تخلص مظہر علی خاں عرف مرزا لطف اللہ" ۴ لیکن زیادہ تر تذکرہ نگاروں نے ولا کا نام مرزا لطف علی لکھا ہے۔ نام کے بعد ولا کے تخلص کے سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ شیفتہ کے ہاں ان کا تخلص "والا" اصل متن میں سہو کتابت کی وجہ سے ہے ۵ اور اس کی تصحیح و صراحت مجلس ترقی ادب، لاہور کے نسخے میں کردی گئی ہے۔

۱۔ ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو: "تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ"، ادبی دنیا، لاہور، بابت دسمبر ۱۹۴۰ء، ص ۳۱۔

۲۔ نادم سیتا پوری: "فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی"، لکھنؤ، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۹ء، ص ۲۶۱۔

۳۔ ڈاکٹر جاوید نہال: "بنگال کا اردو ادب"، طبع دوم، کلکتہ، عثمانیہ بک ڈپو، ۱۹۸۱ء، ص ۱۱۸۔

۴۔ قدرت اللہ قاسم: "مجموعہ نغز"، مرتبہ حافظ محمود خاں شیرانی، طبع اول، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۳۳ء، ص ۳۱۲۔

۵۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ: "گلشن بے خار"، طبع اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء، ص ۶۳۸۔

صفحہ ۱۴۰ پر حامد حسن قادری نے صاحبِ "خرد افروز" کا ادھورا نام شیخ حفیظ الدین لکھا ہے جب کہ خود حفیظ الدین احمد اپنی تصنیف "خرد افروز" کے آغاز میں اپنا پورا نام یوں لاتا ہے "بعد حمد و نعت کے شیخ حفیظ الدین احمد بن شیخ ہلال‌الدین محمد بن شیخ محمد ذاکر صدیقی کہتا ہے کہ . . ."[۱] بعد ازیں ان کے ترجمے "خرد افروز" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

> "عبارت صاف و سادہ ہے اگرچہ میر امن کی سی شگفتگی نہیں ہے، لیکن باقاعدہ و بامحاورہ نثر ہے، تکلفات سے خالی ہے . . . الخ" (داستان‌تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۱۴۰)

جب کہ سید محمد صاحب کے بہ قول :

> "حفیظ‌الدین کا طرز بیان نہایت صاف و سلیس ہے اس میں شوخی و رنگینی مطلق نہیں۔ فصاحت کے ساتھ سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ ان کی نثر زمانۂ غدر اور اس کے بعد کے قریبی زمانے سے بہت ملتی جلتی ہے۔ قواعد زبان اور روزمرہ کی پابندی کے ساتھ الفاظ کا استعمال بہت کچھ آزادی سے کیا گیا ہے۔ نہ ہندی الفاظ کی کثرت ہے اور نہ فارسی، عربی الفاظ کی بھرمار۔ دونوں کا نہایت ہی عمدہ میل ہے۔ سر سید کے اسلوب بیان کی جھلک پائی جاتی ہے"۔[۲]

۱۔ شیخ حفیظ الدین احمد : "خرد افروز"، مرتبہ سید عابد علی عابد، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۲۔

۲۔ مولوی سید محمد : "اربابِ نثر اردو"، طبع دوم، حیدرآباد (دکن) مکتبۂ ابراہیمیہ، ۱۹۳۷ء، ص ۲۱۲۔

مؤلف مزید صراحت کرتے ہیں کہ "۱۸۱۵ء میں حفیظ الدین کی ترک ملازمت کے بعد کپتان ٹامس روبک نے میر کاظم علی جوان وغیرہ سے نظرثانی کرانے کے بعد شائع کی" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۱۴۰) یہاں بنیادی اعتراض یہ ہے کہ "وغیرہ" یا اس قسم کے دیگر الفاظ ایک تاریخ کی کتاب کے شایان شان نہیں ہیں، ویسے ڈاکٹر گیان چند جین نے اس موقعے پر وغیرہ کا تکلف بھی نہیں کیا، چناں چہ لکھتے ہیں "۱۸۱۵ء میں کاظم علی جوان نے اس پر نظر ثانی کی"۔۱ (بحوالہ "ارباب نثر اردو"، ص ۲۰۷) جب کہ حقیقت یہ ہے کہ "دوسرا ایڈیشن کپتان ٹامس روبک کے اہتمام سے میر کاظم علی جوان، منشی غلام اکبر، مرزائی بیگ اور منشی غلام قادر کی نظرثانی و تصحیح کے بعد ۱۸۱۵ء میں شایع کیا گیا"۔۲

مؤلف خلیل علی خاں اشک کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "ان کے ذاتی حالات دریافت نہیں ہوئے" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم ص ۱۴۱) جب کہ "داستان امیر حمزہ" کی ابتداً کے علاوہ جس کے ذریعے خود مؤلف نے ان کا صحیح نام اور تخلص دریافت کیا ہے "انتخاب سلطانیہ" (۱۲۱۰ھ/۱۸۰۵ء) کے دیباچے میں خود نوشت سوانحی کوائف کے ساتھ ساتھ "داستان امیر حمزہ" کی تالیف سے متعلق معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔ ڈاکٹر گیان چند جین: "اردو کی نثری داستانیں"، طبع دوم، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۶۹ء، ص ۲۶۴۔

۲۔ شیخ حفیظ الدین احمد: "خرد افروز"، مرتبہ عابد علی عابد، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۵۲۔

اشک کی یہ تصنیف مؤلف کی نظر سے نہیں گذری ، کیوں کہ انھوں نے " داستان امیر حمزہ" کے بعد صرف "اکبرنامہ" (۱۸۰۹ء) کا ذکر کیا ہے۔ مؤلف یہ بھی لکھتے ہیں کہ "خلیل علی خاں کے بعد 'داستانِ امیر حمزہ' کو منشی نول کشور نے حافظ سید عبداللہ بلگرامی سے مرتب کراکے شایع کیا" (داستان تاریخ اردو ، طبع سوم، ص ۱۴۱) راقم کے خیال میں یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ "نول کشور نے مولوی عبداللہ بلگرامی سے غالب لکھنوی کے ترجمے کی زبان پر نظرثانی کراکے ۱۸۷۱ء میں شایع کیا"۔۱

صفحہ ۱۴۳ پر اکرام علی کے ذیل میں مؤلف کا بیان ہے کہ "ان کے حالات بھی معلوم نہیں" جب کہ اس تاریخ کی تالیف سے بہت پہلے اکرام علی کے حالات پر وسطِ ۱۹۳۷ء میں نادم سیتاپوری نے ایک چھوٹا سا مضمون "علامہ سیتاپوری" کے عنوان سے لکھا تھا اور یہ مجلس ادب سیتاپور، کی جانب سے ایک کتابچے کی شکل میں "علامہ سیتاپوری" کے عنوان سے شایع ہوا تھا، اور اس پر بہ قول نادم سیتاپوری "اس وقت کے ادبی رسائل نے کافی حوصلہ افزا تبصرے کیے تھے"۔۲ اور اس سے بھی پہلے یعنی ۱۹۱۳ء میں قاضی الیاس حسین جعفری ، سیتاپوری نے اکرام علی پر ایک چھوٹا سا مضمون تحریر کیا تھا جو ماہنامہ "الناظر" لکھنؤ میں شایع ہوا تھا ، ان کے علاوہ "سیر المصنفین" کے پاکستانی ایڈیشن میں بھی

۱۔ ڈاکٹر گیان چند جین : "اردو کی نثری داستانیں"، طبع دوم ، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو ، ۱۹۶۹ء ، ص ۴۷۲۔

۲۔ نادم سیتاپوری : "فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی" ، لکھنؤ ، ادارۂ فروغ اردو ، ۱۹۵۹ء ، ص ۱۲۔

اکرام علی کے کچھ حالات دیے گئے ہیں۔ اس صورت میں اگر مصنف چاہتے تو مذکورہ ماخذات کی مدد سے اکرام علی کے کچھ حالات اپنے پڑھنے والوں تک پہنچا سکتے تھے۔ ویسے نادم سیتاپوری کی تصنیف "فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی" اس موضوع پر ایک بہت مفید تصنیف ہے۔ مؤلف مزید لکھتے ہیں کہ :

> " اخوان الصفاء کے نام سے بصرہ میں ایک انجمن تھی اس کے اراکین نے متعدد رسالے مختلف علمی مباحث کے متعلق لکھے ہیں۔ یہ ' رسائل اخوان الصفاء ' عربی زبان کی ایک مشہور و مقبول تصنیف ہے "۔

(داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۱۴۳)

اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ "رسائل اخوان الصفاء" کا صحیح تاریخی پس منظر ایک الجھی ہوئی گتھی ہے، جس کو سلجھانے کی کوشش کم و بیش ایک ہزار برس سے ہو رہی ہے۔ بہ قول نادم سیتاپوری :

> "چوتھی صدی ہجری کی یہ نیم الہامی کتب اس دور کے مشرقی علوم کا ایسا رازِ سربستہ ہیں، جس کے مصنف کی تلاش و جستجو میں آج ایک ہزار سال سے ماہرینِ علم و فن سرگرداں ہیں اور ہزار برس گذرنے کے باوجود اب تک قطعی طور پر یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکا، کہ یہ رسائل کسی ایک شخص کی تصنیف ہیں یا ان متعدد افرادِ علم کی بصیرت افروزی کا نتیجہ ہیں، جنھیں ' اخوان الصفاء ' کے نام سے موسوم کیا

جاتا ہے"-۱

صورت حال یہ ہے کہ مختلف عقائد کے پیرو کاروں اور مختلف نظریات کے حامیوں نے اپنے اپنے انداز میں اور اپنی اپنی روایات کے حوالے سے اس معمے کو حل کر لیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے میں مختلف بلکہ متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔

نہال چند لاہوری کے ذکر میں مؤلف کا بیان ہے کہ "دھلی کے رہنے والے تھے، وہاں سے پنجاب چلے گئے، لاہور کو وطن بنا لیا" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۱۴۶) نہال چند لاہوری کے بارے میں بیش تر تاریخ نویسوں نے یہی لکھا ہے۔ لیکن نادم سیتاپوری کے بقول:

> "ان کے بزرگ لاہور سے آ کر دھلی میں رہ بس گئے تھے۔ نہال چند دھلی میں پیدا ہوئے اور شاہ جہاں آباد ہی کے ماحول میں پلے بڑھے لیکن وطن مالوف کی نسبت کو ہمیشہ سینے سے لگائے رہے"-۲

نادم سیتاپوری کے علاوہ ڈاکٹر جاوید نہال کا بیان بھی یہی ہے کہ "نہال چند لاہوری کے نام سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ لاہور ان کا وطن تھا۔ لیکن اصل میں ان کا مولد شاہ جہاں آباد (دلی) تھا، نہال چند نے اس پر فخر بھی کیا ہے"-۳

۱۔ نادم سیتاپوری: "فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی"، لکھنؤ، ادارۂ فروغ اردو، ۱۹۵۹ء، ص ۱۹۳۔

۲۔ ایضاً، ۲۶۸۔

۳۔ ڈاکٹر جاوید نہال: "بنگال کا اردو ادب"، طبع دوم، کلکتہ، عثمانیہ بک ڈپو، ۱۹۸۴ء، ص ۱۸۳۔

بینی نرائن جہاں کے ذکر میں مؤلف کا بیان ہے کہ "ان کے والد مہاراجہ لکشمی نرائن بڑے رئیس تھے" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص۱۴۶)مؤلف کے اس بیان کا ماخذ "ارباب نثر اردو" ۱ معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اس موقعے پر سید محمد کا بیان بھی یہی ہے، لیکن ڈاکٹر جاوید نہال کا بیان یہ ہے کہ "ان کے پتا کا نام شیوو سٹ نرائن تھا۔ اور ان کے نانا لچھمی نرائن تھے"۔۲

اسی صفحے پر مؤلف مزید لکھتے ہیں کہ "بینی نرائن گردش روزگار سے تباہ ہوکر کلکتہ پہنچے" جب کہ مولوی سید محمد ۳، نادم سیتاپوری ۴ اور ڈاکٹر جاوید نہال۵ اس بات پر متفق ہیں کہ جہاں گردش روزگار سے تنگ آکر لاہور سے نکلے اور آب و دانے کی تلاش میں کئی سال تک ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے کلکتے پہنچے۔ نیز اسی صفحے پر مؤلف نے

۱۔ مولوی سید محمد : "ارباب نثر اردو"، طبع دوم، حیدرآباد (دکن)، مکتبۂ ابراہیمیہ، ۱۹۳۷ء، ص ۲۴۹۔

۲۔ ڈاکٹر جاوید نہال : "بنگال کا اردو ادب"، طبع دوم، کلکتہ، عثمانیہ بک ڈپو، ۱۹۸۴ء، ص ۱۶۳۔

۳۔ مولوی سید محمد : "ارباب نثر اردو"، طبع دوم، حیدرآباد (دکن)، مکتبۂ ابراہیمیہ، ۱۹۳۷ء، ص ۲۴۹-۵۰۔

۴۔ نادم سیتاپوری : "فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی"، لکھنؤ، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۹ء، ص۲۶۶۔

۵۔ ڈاکٹر جاوید نہال : "بنگال کا اردو ادب"، طبع دوم، کلکتہ، عثمانیہ بک ڈپو، ۱۹۸۴ء، ص ۱۶۵۔

"اربابِ نثر اردو"۱ کے تتبع میں جہاں کے بڑے بھائی کا نام کھیم نرائن کے بدلے کھم نراین لکھ دیا ھے۔ جب کہ ان کا صحیح اور پورا نام کھیم نرائن رند ھے۔۲ اس کے بعد صفحہ ۱۴۸ پر جہاں کے تذکرے "دیوانِ جہاں" کے سالِ تکمیل کے بارے میں مؤلف لکھتے ھیں کہ "۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء میں مرتب کیا" حالانکہ یہ تذکرہ ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء میں مرتب و مکمل ھوا تھا۔۳

صفحہ ۱۵۶ پر مؤلف نے مرزا جان طپش کا سنہ ولادت ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۸ء" لکھا ھے جب کہ ڈاکٹر جاوید نہال کا بیان ھے کہ "طپش ۱۷۶۰ء — ۱۷۶۲ء کے درمیان دلی میں پیدا ھوئے"۔۴ اس کے بعد مؤلف محمد بخش مہجور کے باب میں صفحہ ۲۰۰ پر رقم طراز ھیں کہ "جرأت (متوفی ۱۲۴۵ھ / ۱۸۲۹ء)" جب کہ جدید تحقیق کی روشنی میں جرأت کا سنہ وفات ۱۲۲۴ھ ثابت ھو چکا ھے۔ اس کے بعد اسی باب میں مہجور کے بارے میں مؤلف لکھتے ھیں "اس زمانے کے گمنام مصنف ھیں" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۲۰۰) حالانکہ "ریاض الفصحا" (تالیف ۱۲۲۱ھ تا ۱۲۳۶ھ)، "سخن الشعرا"

۱۔ مولوی سید محمد: "ارباب نثر اردو"، طبع دوم، حیدرآباد (دکن)، مکتبۂ ابراھیمیہ، ۱۹۳۷ء، ص ۲۴۹۔

۲۔ ڈاکٹر جاوید نہال: "بنگال کا اردو ادب"، طبع دوم، کلکتہ، عثمانیہ بک ڈپو، ۱۹۸۴ء، ص ۱۶۳۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۰۴۔

۴۔ ایضاً، ص ۲۱۰۔ یہ مسئلہ اختلافی اور تحقیق طلب ھے۔

۵۔ محمد بخش مہجور: "نو رتن"، مرتبہ، خلیل الرحمان داؤدی، طبع اول، لاھور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء، ص ۱۰۔

(۱۲۸۱ھ)، "تذکرۂ شمیم سخن" (۱۲۸۹ھ)، "سیر المصنفین" (۱۹۲۴ء) اور "اردو کی نثری داستانیں" (۱۹۰۴ء) میں مہجور کا ذکر موجود ہے۔ اس سے پہلے مؤلف نے مہجور کی دیگر تصانیف میں صرف ایک تصنیف "گلشن نو بہار" کا ذکر کیا ہے جب کہ خلیل الرحمان داؤدی نے مہجور ہی کی ایک تصنیف "نو رتن" کے مقدمے میں ان کی چار اور تصانیف کا ذکر کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے "انشائے گلشنِ نو بہار" (تکملہ قبل از ۱۲۳۰ھ)، "انشائے چار چمن" (تکملہ قبل از ۱۲۳۰ھ)، "مثنوی در تعریفِ موسیٰ باغ" (زمانۂ تصنیف نامعلوم)، "انشائے نو رتن" (تصنیف ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء) اور "دیوان مہجور" ان کے علاوہ خلیل الرحمان داؤدی نے مہجور (۱۱۹۱ھ تا ۱۲۳۰ھ) کے کچھ حالاتِ زندگی بھی اسی مقدمے میں درج کیے ہیں اور ساتھ ہی مؤلف پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ مہجور کو:

> "گمنام مصنف کہنا، پھر 'گلشن نوبہار' سے ہی چند سطریں نمونے کی پیش کرکے 'ان کا نام زندہ' کرنے کوشش کرنا اور اردو کے کلاسیکی ادب کی بہت اہم کتاب 'نو رتن' کو نظرانداز کردینا ایسی غلطیاں ہیں جو قادری صاحب کی 'داستانِ تاریخِ اردو' میں نہ ہونی چاہیے تھیں"۔[۱]

اس کے بعد "نثر اردو کا چوتھا دور" میں مرزا غالب کے نام و خطاب کے سلسلے میں مؤلف کا بیان ہے کہ "پہلے اسد تخلص تھا پھر حضرت علی کرم اللہ وجہ کے لقب 'اسداللہ الغالب' کی مناسبت

۱۔ محمد بخش مہجور: "نو رتن"، مقدمہ، خلیل الرحمان داؤدی، طبع اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء، ص ۱۰۔

سے غالب تخلص کرلیا" (داستانِ تاریخِ اردو، طبع سوم، ص ۲۳۰)۔ مؤلف کا یہ بیان "آبِ حیات" سے ماخوذ ہے اور ایک لحاظ سے نامکمل بھی، کیوں کہ آزاد نے اس موقعے پر جو قصہ بیان کیا ہے، اس کے بغیر اس واقعے کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس سے آگے "نسل و نسب" کے ذیل میں جس قطعے سے اقتباس پیش کیا ہے اس کا تیسرا مصرع مؤلف نے یوں رقم کیا ہے "ایبکیم از جماعتِ اتراک" جب کہ مولانا حالی نے "یادگارِ غالب" میں اسی مصرعے کو یوں لکھا ہے "ایبکیم از جماعۂ اتراک"[۱] اسی صفحے پر باپ دادا کے عنوان کے تحت مؤلف کا بیان ہے "غالب کے دادا شاہ عالم بادشاہ دھلی (۱۱۷۳ھ/ ۱۷۵۹ء تا ۱۲۲۱ھ/ ۱۸۰۶ء) کے عہد میں سمرقند سے ہندوستان آئے" (داستانِ تاریخِ اردو، طبع سوم، ص ۲۳۰-۱) "یادگارِ غالب" میں مولانا حالی نے بھی مرزا غالب کے حوالے سے یہی بات لکھی ہے، لیکن حاشیے میں خلیل الرحمان داؤدی نے یہ صراحت کی ہے کہ:

> "مرزا قوقان بیگ خان ۱۷۵۰ء سے قبل لاہور پہنچے۔ ادھر شاہ عالم ثانی ۱۷۵۹ء میں تخت پر بیٹھتا ہے، اس لیے کس طرح ممکن کہ مرزا قوقان بیگ خان لاہور پہنچ کر نواب معین الملک (وفات ۱۷۵۰ء) کی ملازمت بھی کریں اور وہ عہد بھی شاہ عالم ثانی (سالِ تخت نشینی ۱۷۵۹ء) کا ہو... نواب معین الملک ... محمد شاہ

۱- مولانا الطاف حسین حالی: "یادگارِ غالب"، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۱۶۔

کے عہد میں صوبےدار تھے، اس لیے مرزا قوقان بیگ خان، شاہ عالم کے زمانے میں نہیں، بلکہ محمد شاہ کے زمانے میں وارد ہند ہوئے"۔۱

"ولادت و تربیت" کے ذیل میں مؤلف رقم طراز ہیں کہ "ایک بزرگ استاد شیخ معظم سے تعلیم حاصل کی، آگرہ کے مشہور ہےنظیر شاعر میاں نظیر اکبر آبادی سے بھی کچھ پڑھا" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۲۳۲) مؤلف کے اس بیان کی تائید مخمور اکبر آبادی یوں کرتے ہیں:

"حکیم قطب الدین باطن نے اپنی تصنیف 'گلستانِ بےخزاں' میں غالب کو نظیر کا شاگرد بتایا ہے اور شہباز سے مراسلت میں، حالی نے بھی دبی زبان سے غالب کا نظیر کے مکتب میں پڑھنا تسلیم کیا ہے۔ بہرحال کلام کے اشتراک سے یہ بہت قرین قیاس ہے کہ غالب کے ذوقِ سخن نے نظیر کے ذوقِ سخن کی آغوش میں تربیت پائی اس کا اتباع کیا"۔ ۲

لیکن غلام رسول مہر اپنی تصنیف "غالب" میں اس بیان کی تردید ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ "میرے نزدیک یہ درست نہیں"۳ بعد از ایں "تحصیلِ فارسی" کے ذیل میں غالب کے فرضی استاد

۱- مولانا الطاف حسین حالی: "یادگارِ غالب"، حاشیہ از، خلیل الرحمان داؤدی، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۱۲۔

۲- سید محمد محمود رضوی مخمور اکبر آبادی: "نظیر نامہ"، کراچی، مشہور آفسٹ پریس، ۱۹۷۹ء، ص ۳۸۲۔

۳- غلام رسول مہر: "غالب"، طبع چہارم، لاہور، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، ۱۹۳۶ء، ص ۲۷۔

ملا عبدالصمد کے بارے میں مؤلف نے "خطوط غالب" کے حوالے سے دونوں بیانات نقل کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

"ان دونوں بیانوں میں مطابقت نہیں ہوسکتی بہ جز اس کے کہ دوسرا بیان بطور ظرافت ہے، یا یہ بات ثابت کرنے کے لیے ہے کہ غالب زبان و ادب فارسی میں کسی کے شاگرد نہ تھے، اور یہی واقعہ معلوم ہوتا ہے" (داستانِ تاریخِ اردو، طبع سوم، ص ۲۳۳)۔

لیکن آگے چل کر رقم طراز ہیں کہ:

"یہ ضرور ہے کہ عبدالصمد ایرانی سے دو سال تک جو فارسی میں گفتگو کی ہوگی، شعر و شاعری کا ذکر و فکر رہا ہوگا اس سے یک گونہ بصیرت پیدا ہوگئی ہوگی، جس نے ذوقِ سلیم، فکرِ صحیح، مطالعۂ وسیع کے ساتھ مل کر آئندہ رائے ثابت کا ملکہ پیدا کردیا" (داستانِ تاریخِ اردو، طبع سوم، ص ۲۳۴)۔

مؤلف سے پہلے مولانا حالی بھی غالب کے استاد کے بارے میں اسی نوع کی تضادِ بیانی کرچکے ہیں مثلاً اپنی تصنیف "یادگارِ غالب" میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

"پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اس کی صحبت میسر آئی اور اس قدر قلیل مدت اس کی صحبت میں گذری تو عبدالصمد اور اس کی تعلیم کا عدم و وجود برابر ہو جاتا ہے"۔[۱]

۱۔ مولانا الطاف حسین حالی: "یادگارِ غالب"، طبع اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۱۹-۸۱۔

آگے چل کر مولانا حالی اسی عبدالصمد کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں کہ :

"مرزا کی حسنِ قابلیت اور حسنِ استعداد نے ملا عبدالصمد کے دل پر گہرا نقش بٹھا دیا تھا کہ یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی وہ مدت تک مرزا کو نہیں بھولا ... اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ دو برس کے قلیل عرصے میں وہ مرزا کو سکھا سکتا تھا، اس میں ہرگز مضائقہ نہ کیا ہوگا"۔۱

مذکورہ بیانات سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ مؤلف اور مولانا حالی دونوں ہی ملا عبدالصمد کے بارے میں کوئی واضح رائے نہیں رکھتے، جب کہ غلام رسول مہر کا خیال ہے کہ :

"ملا عبدالصمد کی تعلیم و آموزش فارسی زبان میں غالب کے کمالِ رسوخ کا سب سے بڑا ظاہری ذریعہ تھی۔ تعلیم کی مدت اگرچہ بہت کم تھی ... لیکن غالب کی غیر معمولی فطری استعداد نے اس مختصر سی صحبت میں اتنا فیض حاصل کرلیا، کہ دوسروں کے لیے مدت العمر کے اکتسابات بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے"۔۲

جب کہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا خیال ہے کہ "فی الحقیقت یہ شخصیت سراسر افسانہ تھی، جسے از راہ مصلحت

۱۔ مولانا الطاف حسین حالی : "یادگارِ غالب"، طبع اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳، ص ۲۰۔

۲۔ غلام رسول مہر : "غالب"، طبع چہارم، لاہور، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، ۱۹۴۶ء، ص ۲۹-۲۸۔

میرزا صاحب نے پیش کردیا تھا"۔۱

غالب کے "قیامِ دھلی" کے ذکر میں مؤلف کا بیان ھے کہ غالباً ۱۸۱۳ء یا ۱۸۱۴ھ [صحیح ع] میں غالب آگرہ چھوڑ کر دھلی آ رھے" (داستانِ تاریخِ اردو، طبع سوم، ص ۲۳۴)۔ جب کہ غلام رسول مہر کے بہ قول "دھلی میں مستقل سکونت ۱۸۱۶ء میں اختیار کی گئی، جب کہ غالب کی عمر قریباً انیس برس کی تھی"۔۲

مؤلف مزید رقم طراز ھیں کہ "لیکن آخر عمر تک کوئی ذاتی مکان نہیں بنایا مختلف محلوں میں کرائے کے مکانوں میں رھا کیے"۔ (داستانِ تاریخِ اردو، طبع سوم، ص ۲۳۴)۔ اس سلسلے میں مولانا حالی کا بھی یہی خیال ھے، چنانچہ لکھتے ھیں کہ "انھوں نے غالباً کوئی مکان اپنے لیے نہیں خریدا، ھمیشہ کرائے کے مکانوں رھا کیے"۔۳ لیکن مولانا مہر نے غالب کے ایک فارسی خط مشمولہ "کلیاتِ نثرِ غالب" کی روشنی میں یہ انکشاف کیا ھے کہ "دھلی میں غالب کا اپنا مکان بھی تھا ... اسے فروخت کر ڈالا ... الخ"۔۴

۱۔ غالب: "دیوان غالب"، (نسخۂ عرشی) مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، طبع اول، علی گڑھ، انجمن ترقی اردو (ھند)، ۱۹۵۷ء، ص ۷۔

۲۔ غلام رسول مہر: "غالب"، طبع چہارم، لاھور، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، ۱۹۴۶ء، ص ۷۸۔

۳۔ مولانا الطاف حسین حالی: "یادگارِ غالب"، طبع اول، لاھور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۔

۴۔ غلام رسول مہر: "غالب"، طبع چہارم، لاھور، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، ۱۹۴۶ء، ص ۸۰۔

مولانا مہر کے اس بیان کی تائید خلیل الرحمان داؤدی کے "حاشیے"۱ اور ڈاکٹر وحید قریشی کی تصنیف "نذرِ غالب"۲ سے بھی ہوتی ہے۔

بعد از ایں زین‌العابدین خاں عارف کے بارے میں مؤلف کا بیان ہے کہ "دو بچے چھوڑ کر جوانی میں ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء میں داغ دے گئے" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۲۳۵) جب کہ مولانا حالی کا بیان ہے "مگر غدر سے چند سال پہلے زین‌العابدین خاں عارف کا انتقال ہو گیا"۳ اور اس کی تصدیق مولانا مہر کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ "عارف کا انتقال جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ اپریل ۱۸۵۲ء میں ہوا"۴ آگے چل کر غالب کے سفرِ کلکتہ کے بارے میں مؤلف کا بیان ہے کہ "۱۸۳۰ء میں کلکتہ گئے" (داستانِ تاریخِ اردو، طبع سوم، ص ۲۳۵)۔ غالب کے سفرِ کلکتہ کے بارے میں مختلف لوگوں نے مختلف رائے دی ہے، مثلاً مولانا حالی فرماتے ہیں "غرض کہ مرزا کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی جب کہ

۱۔ مولانا الطاف حسین حالی: "یادگارِ غالب"، مرتبہ خلیل الرحمان داؤدی، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۔

۲۔ ڈاکٹر وحید قریشی: "نذرِ غالب"، طبع دوم، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، ۱۹۷۰ء، ص ۱۷۹۔

۳۔ مولانا الطاف حسین حالی: "یادگارِ غالب"، طبع اول"، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۵۲۔

۴۔ غلام رسول مہر: "غالب"، طبع چہارم، لاہور، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، ۱۹۴۶ء، ص ۶۴۔

وہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتے پہنچے"-۱ غالب کی عمر کا چالیسواں سال ۱۸۳۸ء بنتا ہے اور کچھ کم کا مطلب یہ ہے کہ ۳۸—۱۸۳۷ء میں غالب کلکتہ پہنچے، جو مولانا مہر کی تحقیق کے بعد غلط ثابت ہو جاتا ہے، باوجود اس کے کہ مولانا حالی کے استدلال کی بنیاد خود غالب کی تحریر پر ہے اور مؤلف کا بیان اسی سے ماخوذ ہے، مولانا مہر نے بڑی تحقیق کے بعد داخلی اور خارجی شواہد کی مدد سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "وہ (غالب) عیدِ شوال ۱۲۴۲ھ کے بعد یعنی اپریل ۱۸۲۷ء میں دہلی سے روانہ ہوئے" ۲ اور "۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے، اس طرح سفر میں کم و بیش ۱۰ ماہ صرف کیے"-۳

مؤلف مزید رقم طراز ہیں کہ "۱۲۵۸ھ / ۱۸۵۶ء میں دہلی کالج میں 'مدرسِ فارسی' کا جدید عہدہ قائم کیا گیا" اس جملے میں ۱۲۵۸ھ کی مطابقت ۱۸۵۶ء سے ظاہر کی گئی ہے جب کہ صحیح مطابقت ۱۸۴۲ء ہے- بعد از ایں مؤلف کا بیان ہے کہ "۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۸ء میں جو کوتوالِ شہر تھا . . . اس نے قمار بازی کے الزام میں غالب کو گرفتار کر لیا" (داستانِ تاریخِ اردو، طبع سوم، ص ۲۳۵) مؤلف کے اس بیان کا ماخذ "یادگارِ غالب" ہے اور جدید تحقیق کے مطابق غلط بھی، کیوں کہ جدید تحقیق کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ:

۱- مولانا الطاف حسین حالی: "یادگارِ غالب"، طبع اول لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۲۶—۲۵-

۲- غلام رسول مہر: "غالب"، طبع چہارم، لاہور، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، ۱۹۴۶ء، ص ۹۲-

۳- ایضاً، ص ۱۰۵-

"غالب کی گرفتاری ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو عمل میں آئی تھی اور ۲ جولائی ۱۸۴۷ء کو عدالتِ فوجداری کے مقدمے کا فیصلہ ہوا پھر غالب نے اپیل کیا۔ اس میں بھی کم سے کم دو تین ماہ ضرور لگ گئے ہوں گے اور تین مہینے غالب جیل میں رہے، گویا وہ ۱۸۴۷ء کے اواخر میں یا ۱۸۴۸ء کے اوائل میں قید سے رہا ہوئے"۔۱

نثار احمد فاروقی کے اس بیان کی تائید خلیل الرحمان داؤدی کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ انھوں نے بھی ایک معاصرانہ شہادت کے حوالے سے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ "یہ حادثہ ۱۸۴۷ء مطابق ۱۲۶۳ھ میں پیش آیا"۔۲ چوں کہ مولانا حالی نے اس قید کے ساتھ دو سو روپے جرمانے کا ذکر نہیں کیا، اس لیے مؤلف کو بھی اس کی خبر نہ ہوئی۔

خطوطِ غالب کے سلسلے میں مؤلف کا بیان ہے کہ:

"۱۸۵۰ء تک غالب فارسی میں خط لکھا کرتے تھے اس سال میں بہادر شاہ ظفر نے ان کو تاریخ نویسی کی خدمت سپرد کی . . . اب اس تاریخ کے ساتھ خطوطِ فارسی پر بھی محنت کرنا دشوار تھا، اس لیے اردو

۱۔ نثاراحمد فاروقی: "تلاشِ غالب"، طبع اول، لاہور، کتابیات، ۱۹۶۹ء، ص ۸۸۔

۲۔ مولانا الطاف حسین حالی: "یادگارِ غالب"، مرتبہ خلیل الرحمان داؤدی، طبع اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۴۱۔

میں خط و کتابت شروع کر دی۔ پھر غدر کے بعد صدماتِ اعزہ و احباب، مالی تردّدات اور پیری و امراض نے زیادہ مضمحل کر دیا تو ۱۸۶۱ء میں ارادہ کر لیا اور اعلان کر دیا کہ فارسی انشاء پردازی ترک کر کے، اردو ہی میں لکھا کریں گے ... الخ" (داستانِ تاریخِ اردو، طبع سوم، ص ۲۵۶)۔

اس سلسلے میں مولانا غلام رسول مہر اپنی تصنیف "خطوطِ غالب" کے مقدمے میں یوں رقم طراز ہیں کہ:

"اس بارے میں ۱۸۵۰ء کی تحدید ٹھیک نہ ہوگی۔ اب ۱۸۴۸ء کے لکھے ہوئے خطوط بھی چھپ چکے ہیں اور ان کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پیش تر بھی میرزا حسبِ ضرورت اردو میں خط لکھتے رہے ہوں گے ... بہرحال صحیح یہی ہے کہ جب تک اردو کا رواج کم تھا، میرزا فارسی میں خط و کتابت کرتے رہے۔ پھر جیسے جیسے اردو کا رواج بڑھتا گیا ... انھوں نے بھی اردو کو ذریعۂ مخابرت بنالیا"۔[۱]

جب کہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا خیال ہے کہ:

"غالب کی اردو خطوط نویسی کا آغاز (موجودہ خطوط کی روشنی میں) مارچ ۱۸۴۸ء میں ہوا جب ان کی عمر پچاس سال سے متجاوز تھی ... مولانا حالی نے

۱۔ غلام رسول مہر: "خطوطِ غالب"، طبع پنجم، لاہور، شیخ غلام علی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۷۔

قلعۂ معلیٰ کے تعلق اور مصروفیات کو اردو خطوط نویسی
کا باعث قرار دیا ہے۔ یہ ایک اضافی سبب ہو سکتا
ہے بنیادی سبب طبیعی تھا . . . خود غالب کا بیان
ہے 'فارسی خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے پیرانہ
سری وضعف کے صدموں سے محنت پژوی و جگر کاوی
کی قوت مجھ میں نہ رہی"۔۱

اس کے بعد " نثر اردو کا پانچواں دور " کے تحت صفحہ ۳۹۸ پر مؤلف نے امیر کا سال پیدائش ۱۲۴۴ھ / ۱۸۳۲ء [صحیح ۱۸۲۸ء] لکھا ہے جب کہ یہ ایک اختلافی موضوع ہے، کیوں کہ مختلف لوگوں نے مختلف سال لکھا ہے مثال کے طور پر شاہ محمد ممتاز علی آہ کا بیان ہے کہ امیر "۱۶ شعبان المعظم ۱۲۴۴ء میں دوشنبہ کے دن ساڑھے دس بجے لکھنؤ میں پیدا ہوئے"۔۲ اور مولوی امیر احمد علوی لکھتے ہیں کہ "بادشاہ نصیرالدین حیدر کے عہدِ سلطنت میں ۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ دو شنبہ کے دن . . . ولادت باسعادت ہوئی"۔۳ اور سید محمد عبدالحکیم حکمت کے مطابق "حضرت خدائے سخن بروز دو شنبہ ۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ بہ عہد نصیرالدین حیدر بادشاہ اودھ

۱۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار: "محاسنِ خطوطِ غالب"، طبع اول، لاہور، مکتبۂ خیابان ادب، ۱۹۶۹ء، ص ۱۸۔

۲۔ شاہ محمد ممتاز علی آہ: "امیر مینائی"، طبع اول، لکھنؤ، ادبی پریس، ۱۹۴۱ء، ص ۱۔

۳۔ مولوی امیر احمد علوی: "طرۂ امیر"، طبع اول، لکھنؤ، انوارالمطابع، ۱۹۲۸ء، ص ۳۔

بیت السلطنت لکھنؤ میں پیدا ہوئے"۔۱ اور ڈاکٹر کریم الدین احمد کے بہ قول :

"امیر مینائی ۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ مطابق ۲۱ فروری ۱۸۲۶ء بروز شنبہ دن کے ساڑھے دس بجے لکھنؤ میں پیدا ہوئے"۔۲

اور ڈاکٹر ابو محمد سحر کا بیان ہے کہ "امیر احمد مینائی ۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ (مطابق ۲۲ فروری ۱۸۲۹ء) کو بروز دوشنبہ بہ وقت ساڑھے دس بجے لکھنو میں پیدا ہوئے"۔۳

اسی صفحے پر مؤلف مزید رقم طراز ہیں کہ :

"۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۲ء میں جب کہ امیر صاحب کی عمر بیس سال کی تھی واجد علی شاہ نے ان کو طلب کیا اور کلام سنا، بادشاہ کے حکم سے دو کتابیں 'ارشادالسلطان' اور 'ھدایت السلطان' لکھ کر پیش کیں اور دربارِ شاہی سے خلعت پایا"۔

اس سلسلے میں صاحبِ "طرۂ امیر" کا بیان ہے کہ " اس محبت بیز و عشق ریز سرکار تک منشی امیر احمد کی رسائی ۱۲۶۹ھ میں ہوئی دو کتابیں 'ارشادالسلطان' اور 'ھدایت السلطان' تصنیف کر کے حضور اقدس میں گذاریں اور خلعتِ فاخرہ سے سرفراز ہوئے"۔۴

۱۔ سید محمد عبدالحکیم حکمت: "دبدبۂ امیری"، طبع اول، بانکی پور، پٹنہ، برقی مشین پریس، ۱۹۳۷ء، ص ۱۰۔

۲۔ ڈاکٹر کریم الدین احمد : "امیر احمد مینائی اور ان کے تلامذہ"، طبع اول، لاہور، آئینۂ ادب، ۱۹۸۲ء، ص ۱۳۔

۳۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر : "مطالعۂ امیر"، طبع اول، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۴ء، ص ۶۷۔

۴۔ مولوی امیر احمد علوی : "طرۂ امیر"، طبع اول، لکھنؤ، انوارالمطابع، ۱۹۲۸ء، ص ۱۶۔

اور ڈاکٹر ابو محمد سحر کا بیان ہے کہ :

" واجد علی شاہ کے دربار میں امیر کی باریابی کا . . . تذکرہ نگاروں نے ۱۲۶۹ھ لکھا ہے ، لیکن یہ صحیح نہیں۔ ' شرح ہدایت السلطان ' کے دستیاب ہونے سے معلوم ہوا ہے کہ یہ کتاب ۱۲۶۸ھ کی تالیف ہے ' رموز تدقیات ' اس کا تاریخی نام ہے . . . یہ کتاب بادشاہ کے حکم پر ۱۲۶۸ھ میں لکھی جا چکی تھی اور امیر اس سے پہلے دربار میں باریاب ہوکر قصیدہ اور مثنوی ' کبوتر نامہ ' وغیرہ پیش کر چکے تھے ، واجد علی شاہ کے دربار میں امیر کی رسائی اگر اور پہلے نہیں تو ۱۲۶۸ھ میں ضرور ہو چکی تھی"۔۱

اسی صفحے پر مؤلف مزید رقم طراز ہیں کہ امیر "۴۲ برس ریاست رام پور میں بڑی عزت و راحت سے رہے"۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ امیر کے قیامِ رام پور کے آخری چند برس پر مؤلف کے اس بیان کا اطلاق نہیں ہوتا ، کیوں کہ نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد جب نواب مشتاق علی خاں سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انھوں نے جنرل اعظم الدین خاں کو مدارالمہام مقرر کیا اور انھیں خصوصی اختیارات دے کر سیاہ و سفید کا مالک بنادیا ، جنرل اعظم جو انگریزی طرزِ حکومت کے دل دادہ تھے، ان کی انقلابی اصلاحات سے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں تبدیلیاں آئیں وہیں امیر کی تنخواہ میں بھی ایک سو سولہ روپے کی کمی ہوئی ، جس سے ان کی مالی پریشانیوں میں اضافہ ہوگیا۔ اس کے علاوہ لغت کی تالیف بھی التوا میں پڑ گئی اور مفتی طالب حسین اور ان کی اہلیہ کا انتقال

۱۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر : "مطالعۂ امیر"، طبع اول ، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو ۱۹۶۴ء ، ص ۷۷-۷۶۔

بھی اسی زمانہ میں ہوا ، اور قرض کا بار بڑھ گیا پھر بیماریاں بھی شدت اختیار کرگئیں۔ الغرض پریشانیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کی لفظی تصویر امیر نے اپنے خطوں میں جابجا کھینچی ہے۔

" نثرِ اردو کا چھٹا دور" (غدر کے بعد سے بیسوی صدی کے شروع تک) میں صفحہ ۴۴۸ پر محمد حسین آزاد کا سالِ ولادت مؤلف نے ۱۸۳۲ء لکھا ہے ، جب کہ ڈاکٹر محمد صادق کے مطابق " آزاد ۱۰ جون ۱۸۳۰ء کو جمعرات کے دن پیدا ہوئے "۔۱ اسی صفحے پر مؤلف مزید لکھتے ہیں کہ " آزاد کے والد نے ۱۸۳۷ء میں ' اردو اخبار ' دھلی سے نکالا " جب کہ ڈاکٹر محمد صادق کے بہ قول "چھاپہ خانہ لگنے پر ۱۸۳۶ء میں شمالی ہند میں اردو کا سب سے پرانا اخبار 'دھلی اردو اخبار' جاری ہوا "۔۲ واضح رہے کہ اس اخبار کا نام " اردو اخبار" نہیں بلکہ "دھلی اردو اخبار"۳ تھا ۔

۱۔ ڈاکٹر محمد صادق: "محمد حسین آزاد ۔ احوال و آثار"، طبع اول ، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب ، ۱۹۷۶ء ، ص ۱۲ ۔

۲۔ ایضاً ، ص ۱۱ ۔

۳۔ یہ اخبار "جام جہاں نما " (کلکتہ ، سنہ آغاز ۱۸۲۲ء) کے بعد اردو کا قدیم ترین ہفتےوار اخبار تھا، اور یہ بیس برس تک مختلف ناموں سے نکلتا رہا، مثلاً "اخبارِ دھلی" جو ۱۰ مئی ۱۹۳۰ء کو تبدیل ہوکر "دھلی اردو اخبار" ہوا اور پھر ۱۲ جولائی ۱۹۵۷ء کو "اخبار الظفر" ہوگیا اور دس شماروں کے اجراء کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا ۔ اس کا آخری شمارہ ۱۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو نکلا ۔ (بحوالہ: محمد عتیق صدیقی : "صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و رسائل"، طبع اول ، علی گڑھ ، انجمن ترقی اردو ، ۱۹۶۲ء ، ص ۱۰۰)۔

آگے چل کر مؤلف کا بیان ہے کہ "آخر ایک مدت بعد ۱۸۶۳ء میں لاہور پونہچے" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۴۵۰) جب کہ اس سلسلے میں سید آغا حیدر "آزاد کی زندگی کی جھلک سنین کے آئینے میں" رقم طراز ہیں کہ "۱۸۶۱ میں لاہور وارد ہوئے اور پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر میں ملازم ہوئے"۔ اور ڈاکٹر محمد صادق کے بہ قول "۱۸۶۰ء کے آخر یا اگلے سال کے شروع میں وہ پندرہ روپے ماہوار پر جنرل پوسٹ آفس لاہور میں سر رشتہ دار کے طور پر ملازم پائے گئے"۔[۱] اسی سلسلے میں مؤلف مزید لکھتے ہیں:

> "۱۸۶۳ء میں لاہور پہنچے۔ اور پنڈت من پھول، میر منشی لفٹیننٹ گورنر پنجاب کی سفارش سے سر رشتۂ تعلیم میں پندرہ روپیہ کے ملازم ہو گئے۔" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۴۵۰)۔

جب کہ ڈاکٹر محمد صادق کا بیان ہے کہ:

> "وہ محکمۂ تعلیم میں ملازم ہونے کے خواہاں تھے اور اس غرض کے لیے ۱۸۶۰ء میں جب وہ ابھی جگراوں میں مقیم تھے، ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب سے لدھیانہ میں ملے۔ بعد ازاں انھوں نے اس سے مئی ۱۸۶۱ء میں دوبارہ ملاقات کی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ وہ بدستور جنرل پوسٹ آفس میں ۱۸۶۳ء کے بعد تک کام کرتے رہے۔ آخر لفٹننٹ گورنر کے میر منشی پنڈت من پھول کے توسل سے انھیں ڈائریکٹر

۱۔ ڈاکٹر محمد صادق: "محمد حسین آزاد - احوال و آثار"، طبع اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۶ء، ص ۳۸۔

پبلک انسٹرکشن کے محکمے میں معمولی سی نوکری
مل گئی۔ یہ جنوری ۱۸۶۴ء کی بات ہے"۔۱

اس کے بعد مؤلف کا بیان ہے کہ "آزاد ۱۸۶۵ء میں کسی سرکاری کام کے لیے کلکتہ گئے"۔ (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۴۵۱) جب کہ ڈاکٹر محمد صادق کے بہ قول "۱۸۶۶ء میں حکومت نے آزاد کو ایک خاص کام کے لیے کلکتہ بھیجا"۔۲ اسی صفحے پر مؤلف مزید رقم طراز ہیں کہ " آزاد ۱۸۶۵ء میں کسی سرکاری کام کے لیے کلکتہ گئے۔ اسی سال . . . سرکاری سفارت کی غرض سے کابل و بخارا گئے۔ ایران کا سفر بھی کیا۔ دوبارہ ۱۸۸۳ء میں ایران گئے"۔ آزاد کے اسفارِ ایران سے متعلق یہ ایک بڑا ادبی مغالطہ ہے کہ آزاد ایک سے زائد مرتبہ ایران گئے، اس کا شکار مؤلف ہی نہیں خود طاہر نبیرۂ آزاد بھی ہیں چناں چہ "سخندانِ پارس" کے دیباچے میں رقم طراز ہیں کہ " آپ (آزاد) نے ایران کے سفر بھی کیے" ۔۳ جب کہ ڈاکٹر محمد صادق نے تمام داخلی اور خارجی شواہد کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ " آزاد پہلی اور آخری بار ۱۸۸۵ء میں ایران تشریف لے گئے"۔۴ اس کی روشنی میں

۱۔ ڈاکٹر محمد صادق: "محمد حسین آزاد ۔ احوال و آثار"، طبع اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۶ء، ص ۳۸ ۔

۲۔ ایضاً، ص ۴۳ ۔

۳۔ مولانا محمد حسین آزاد: "سخن‌دانِ پارس"، دیباچہ از طاہر نبیرۂ آزاد، طبع دوم، لاہور، آزاد بک ڈپو، ۱۹۵۷ء، ص ۵ ۔

۴۔ ڈاکٹر محمد صادق: "محمد حسین آزاد ۔ احوال و آثار"، طبع اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۶ء، ص ۵۳ ۔

۱۸۸۳ء میں آزاد کا ایران جانا خارج از بحث ہوجاتا ہے۔ صفحہ ۴۵۳ پر "اردو شاعری پر آزاد کا احسان" کے عنوان کے تحت مؤلف کا بیان ہے کہ:

> "انجمن پنجاب کا سب سے پہلا مشاعرہ ۸ مئی ۱۸۷۴ء کو ہوا تھا، اس میں آزاد نے (شام کی آمد اور رات کی کیفیت) پڑھ کر سنائی۔ یہ مشاعرہ صرف گیارہ مہینے جاری رہا"۔

جب کہ پنڈت کیفی کے بہ قول "یہ مناظم ۳۰ جون ۱۸۷۴ء کو انجمن پنجاب کے مکان میں ہوا تھا"[۱] آگے چل کر مؤلف نے "آزاد کی تصانیف" کے سلسلے میں ان کتابوں کا ذکر کیا ہے جو آزاد کی وفات کے بعد ان کے ورثاء نے قلمی مسوّدات سے مرتب کر کے شایع کی ہیں، یہ بات "تذکرۂ علماء"، "فلسفۂ الٰہیات" اور "بیاضِ آزاد" کی حد تک تو ٹھیک ہےلیکن اس فہرست میں مؤلف نے چند ایک نام ان کتابوں کے بھی دے دیے ہیں جو آزاد کی زندگی میں شایع ہو چکی تھیں، مثلاً "سپاک و نماک" جس کا سالِ تصنیف ۱۸۹۵ء ہے اور جسے "مولوی ممتاز علی نے ۱۸۹۷ء میں شایع کیا تھا"[۲] اور "ڈرامۂ اکبر" جو آزاد کی دیوانگی کے سبب مکمل نہیں ہو سکا لیکن بہ قول ڈاکٹر اسلم فرخی:

> "۱۹۰۶ء میں شیخ عبدالقادر نے مخزن میں شایع

۱- پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی: "منشورات"، طبع چہارم، لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۵۰ء، ص ۲۶۹۔

۲- ڈاکٹر اسلم فرخی: "محمد حسین آزاد"، جلد دوم، طبع اول، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۵ء، ص ۶۴۰۔

کردیا ۔ اور آزاد کا یہ نقشِ ناتمام منظرِ عام پر آ گیا"۔ ۱

اور "مکتوباتِ آزاد" جس کے بارے میں ڈاکٹر اسلم فرخی کا بیان ہے کہ :

> "۱۹۰۶ء میں مخزن میں 'مکتوباتِ آزاد' کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا اور چھے سات مہینے تک جاری رہا یہ تمام خطوط سید حسن بلگرامی کے نام تھے۔ یہی مکتوبات بعد میں کتابی شکل میں شایع کردیے گئے"۔ ۲

یہ تینوں تصانیف جن کو مؤلف نے ان کتابوں کی فہرست میں شامل کیا ہے ، جو آزاد کی وفات کے بعد شایع کی گئیں ، لیکن جیسا کہ مذکورہ بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی اشاعت آزاد کی وفات ۱۹۱۰ء سے قبل ہوچکی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑی کمی اس باب میں یہ محسوس ہوتی ہے کہ مؤلف نے کتابوں کے نام کے ساتھ ان کے سنہ اشاعت درج نہیں کیے۔

صفحہ ۵۳۶ پر مولوی نذیر احمد کے ذکر میں مؤلف کا بیان ہے کہ " ۶ دسمبر ۱۸۳۶ء (۲۳ جمادی الاول ۱۲۵۲ھ) کو پیدا ہوئے"۔ اس موقعے پر مؤلف نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ لیکن آگے چل کر دھلی کالج کی تعلیم کے سلسلے میں ایک حاشیے میں "حیات النذیر" کے حوالے سے مختلف سنین و واقعات کے مطالعے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "خود ان کو اپنا سالِ ولادت ۱۸۳۳ء

۱۔ ڈاکٹر اسلم فرخی: "محمد حسین آزاد"، جلد دوم، طبع اول، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۵ء، ص ۵۰۱۔

۲۔ ایضاً، ص ۶۵۱۔

یاد تھا۔ اور یہی سال انھوں نے ڈپٹی کلکٹری کی درخواست میں لکھا تھا۔ قرائن و حالات سے یہی درست معلوم ہوتا ہے" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم۔ ص۵۳۸) مصنف"حیات النذیر" اور مؤلف کااستدلال اپنی جگہ درست ہے مگر جدید تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ نذیر احمد کا صحیح سالِ ولادت "۱۸۳۰ء"۱ ہے۔ اس کے بعد ابتدائی تعلیم کے حوالے سے مؤلف کا بیان ہے کہ "۱۴ برس کی عمر تھی کہ والد ان کو لے کر دھلی آئے"۔ (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۵۳۶) جب کہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے مطابق "مولوی سعادت علی اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر ۱۸۴۲ء میں دھلی پہنچے"۔۲

اسی ذیل میں مدرسے کی زندگی سے متعلق مؤلف نے مرزا فرحت اللہ بیگ کی جس روایت سے اتفاق کرتے ہوئے ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے، ہر چند کہ اس کا ماخذ خود مولوی نذیر احمد ہیں۔ لیکن اس سے یا اس قسم کی دیگر متضاد اور مبالغہ آمیز روایات سے اس دور کے مذہبی علماء، ان کے گھرانوں اور دینی مدارس کے بارے میں جو منفی تصورات جنم لیتے ہیں، ان کی تردید ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی اپنے تحقیقی مقالے میں یوں کرتے ہیں:

> "حقیقت یہ ہے کہ نذیر احمد نے اپنی شوخیٔ طبع سے اس قسم کے واقعات کو بڑے چٹپٹے انداز میں بیان کیا ہے۔ خوش مذاق راویوں نے مبالغے کا عنصر خارج کیے بغیر ان واقعات کو نقل کیا؛ بلکہ نذیر احمد کے

۱۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: "مولوی نذیر احمد دھلوی۔ احوال وآثار"، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۷۱ء، ص ۳۴—۳۳۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۱۔

حسنِ بیان کی داد دیتے ہوئے مبالغے کی دو ایک تہیں اور چڑھا دیں"۔۱

دھلی کالج کی تعلیم کے حوالے سے مؤلف نے جس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ اس کا ماخذ بھی خود نذیر احمد ہیں۔ لیکن اس کہانی میں جو واقعاتی نوعیت کی غلطیاں ہیں مثلاً کہانی کے مطابق داخلے کے وقت نذیر احمد ایک بھولے بھالے بچے ہیں جب کہ یہ طے ہے کہ دھلی کالج میں ان کا داخلہ جنوری ۱۹۴۶ء میں ہوا۔ یوں داخلے کے وقت ان کی عمر پندرہ سولہ سال بنتی ہے۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب دھلی کالج کی شہرت عروج پر ہے اور اس سے فارغ التحصیل طلبہ نہایت ذمے دار عہدوں پر فائز ہو رہے ہیں اور پھر یہاں ماہ وار وظیفے کی سہولت بھی موجود ہے، دوسری طرف نذیر احمد اپنی گدایانہ زندگی سے بیزار ہیں "ان حقائق کے پیشِ نظر قرینِ قیاس یہی ہے کہ دھلی میں تین سال تک رہنے کے بعد جب ان کی آنکھیں کھلیں اور کالج کے چرچے سنے تو دونوں بھائیوں نے دھلی کالج میں داخلے کی صورت نکالی ہوگی"۔۲

اس کے بعد صفحہ ۵۲۹ پر مؤلف مزید لکھتے ہیں:

"جس زمانے میں نذیر احمد صاحب، مولوی عبدالخالق صاحب سے پڑھتے تھے اور ان کے گھر کا کام کیا کرتے تھے، ان کی خورد سال پوتی کو گود میں لیے

۱۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: "مولوی نذیر احمد دھلوی۔ احوال و آثار"، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۷۱ء، ص ۴۳۔

۲۔ ایضاً، ص ۴۸۔

پھرنا اور اس کی ٹہل کرنا بھی ان کے ذمے تھا۔
خوبیٔ تقدیر سے آخر بڑے ہوکر اسی لڑکی سے ان
کی شادی ہوئی۔"

واضح رہے کہ اسی لڑکی کے بارے میں مرزا فرحت‌اللہ بیگ نے خود نذیر احمد کی زبانی جو قصہ بیان کیا ہے اس کے مطابق یہی لڑکی اتنی بڑی تھی، کہ "جب تک نذیر احمد سے سیر دو سیر مصالحہ نہ پسوا لیتی، گھر سے نہ نکلنے دیتی تھی"۱ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہی لڑکی جس کو نذیر احمد گود میں لیے پھرتے تھے، وہ تین سال میں کس طرح مصالحہ پسوانے اور بٹا چھین کر انگلیاں کچلنے پر قادر ہو گئی۔ اس حساب سے ۵۳-۱۸۵۲ء میں جب نذیر احمد کا عقد ہوا تو بہ قول ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی "لڑکی کی عمر ۱۱-۱۰ (سال) کی تھی۔ عام حالات میں زوجین کی عمروں میں یہ تفاوت قرین قیاس نہیں"۔۲ آگے چل کر مولوی عبدالخالق کی پوتی کو گود میں لیے پھرنے والی روایت کے متعلق ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ اس "روایت کی کوئی سند نہیں، دوسری کے راوی خود نذیر احمد ہیں"۳ اس لیے اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن

۱۔ مرزا فرحت اللہ بیگ: "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی"، طبع دوم، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۱ء، ص ۵۶۔

۲۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: "مولوی نذیر احمد دہلوی۔ احوال و آثار"، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۷۱ء، ص ۲۳۔

۳۔ ایضاً ص ۲۳۔

اس موقعے پر مؤلف کو ان دونوں متضاد روایتوں کو ایک لڑی میں پروکر شاملِ کتاب نہیں کرنا چاہیے تھا ، کیوں کہ یہ غیر سنجیدگی ایک تاریخ کی کتاب کے شایانِ شان نہیں۔ مؤلف مزید لکھتے ہیں :

" اسی زمانے میں گورنمنٹ نے ان کو قانونِ انکم ٹیکس کے ترجمے کی خدمت سپرد کی۔ یہ ترجمہ بڑی قابلیت سے کیا۔ اس کے بعد تعزیراتِ ہند کے ترجمے کا کام ملا۔ اور اس کے صلے میں کانپور کی تحصیل داری ملی۔ دو برس تحصیل دار رہے۔ ترجمہ ختم ہونے پر ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر بنادیے گئے"۔ (داستان تاریخ اردو ، طبع سوم ، ص ۵۴۰)۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ :

" الغرض پینل کوڈ کے ترجمے میں ان کا حصہ سب سے زیادہ اور سب سے اہم ہے۔ اس خدمت کے صلے میں مترجمین کو سونے کی گھڑیاں انعام میں ملیں اور تینوں کو ڈپٹی کلکٹری کے لیے نامزد کردیا گیا۔ اس وقت ڈپٹی کلکٹری کی جگہ خالی نہ تھی، اس لیے انھوں نے ۱۸۸۲ء میں تحصیل سلیم پور (ضلع کانپور) کی تحصیل داری قبول کرلی"۔۱

یعنی کہ ترجمے کے خاتمے پر دیگر مترجمین کے ساتھ ساتھ نذیر احمد کو بھی ڈپٹی کلکٹری کے لیے نامزد کیا گیا تھا ، لیکن چوں کہ جگہ خالی نہ تھی اس لیے انھیں تحصیل دار بننا پڑا۔ جب

۱۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: "مولوی نذیر احمد دھلوی۔ احوال و آثار" ، طبع اول ، لاہور ، مجلس ترقیٔ ادب ، ۱۹۷۱ء ، ص ۵ ۔

کہ مؤلف کے بیان سے یہ غلط تاثر ملتا ہے کہ ترجمے کے آغاز میں نذیر احمد تحصیل دار ہوئے اور دو سال بعد اختتام پر ڈپٹی کلکٹر ہوگئے۔ اس کے علاوہ مؤلف کے بیان میں لفظ "صلے" کے استعمال سے جو تضاد پیدا ہو رہا ہے، اس کی خرابی اپنی جگہ الگ ہے۔

صفحہ ۵۴۷ پر نذیر احمد کی وفات کے سلسلے میں مؤلف کا بیان ہے "خاکسار مؤلف نے قرآنِ مجید سے تاریخِ وفات نکالی۔ ۱۲۳۰ھ" یہ یقیناً سہوِ کاتب ہے کہ ۱۳۳۰ کی جگہ ۱۲۳۰ نے لے لی ورنہ اس کتاب میں مؤلف نے تاریخ گوئی اور سنین کی مطابقت کے سلسلے میں جس چابک دستی کا ثبوت دیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔

صفحہ ۵۴۸ پر مؤلف نے "توبۃ النصوح" کا سالِ طباعت ۱۸۷۷ء لکھا ہے جب کہ جدید تحقیق سے ثابت ہوچکا ہے کہ نذیر احمد نے ۱۸۷۳ء میں 'توبۃ النصوح' تصنیف کی اور اسی سال سرکاری انعام کے مقابلے میں پیش کردی"۔۱ مؤلف نے "رویائے صادقہ" اور "ایامیٰ" کے سنہ طباعت یا سنہ تصنیف کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ تاہم ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے دونوں کا سنہ بالترتیب "۱۸۹۴ء اور ۱۸۹۱ء لکھا ہے"۔۲ ان سنین سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ "ایامیٰ" "رویائے صادقہ" سے پہلے تصنیف ہوئی، اس لیے مؤلف کی دی ہوئی ترتیب غلط ہے کیوں کہ انھوں نے "رویائے صادقہ" کا تذکرہ "ایامیٰ" سے پہلے کیا ہے۔ مؤلف نے "ترجمۂ قرآن مجید" کا سالِ تصنیف نہیں لکھا اور اس کے علاوہ اسی ذیل میں بقیہ دو تصانیف کا سالِ تصنیف لکھا ہے۔ بلکہ تیسری

۱۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: "مولوی نذیر احمد دہلوی۔ احوال و آثار"، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۷۱ء، ص ۳۴۷۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۶۱۔

کتاب کے سالِ تصنیف کے ساتھ ہجری مطابقت بھی دی ہے۔ ویسے نذیر احمد کے قرآنِ مجید کے "ترجمے کا آغاز ۱۸۹۳ء میں ہوا اور ڈھائی برس کی شب و روز کی محنت سے ۱۸۹۵ء کے اواخر میں مکمل ہوا"۔۱ "ترجمۂ قرآن" کے بعد مؤلف کا بیان ہے کہ "الاجتہاد، عقائد اسلامی کا عقلی ثبوت ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۸ء میں لکھی"۔ جب کہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے بہ قول ان کے پاس اس کتاب کا جو پہلا ایڈیشن ہے "اس کے سرورق پر کتاب کے نام کے ساتھ سن طباعت ۱۳۲۵ھ درج ہے"۲ اس کے بعد مؤلف نے "امہات الامم" اور "ادعیۃ القرآن" کا ذکر کیا ہے مگر سنین درج نہیں کیے ہیں تاہم دونوں بالترتیب ۱۹۰۸ء اور ۱۳۲۱ھ میں لکھی گئیں۔

مولانا الطاف حسین حالی کے ذکر میں ان کی خود نوشت سے جو اقتباس مؤلف نے نقل کیا ہے اس کے مطابق مولانا حالی کا "سلسلۂ نسب ۲۸ واسطے سے حضرت ابو ایوب انصاری رضہ تک پہنچتا ہے" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۱۰-۶۰۹) یہ سہو کتابت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مولانا حالی کا سلسلۂ نسب ۲۶ واسطے سے حضرت ابو ایوب انصاری رضہ تک"۳ پہنچتا ہے۔ آگے چل کر "مولانا حالی کی تصانیفِ نثر"

۱۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی: "مولوی نذیر احمد دہلوی۔ احوال و آثار"، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۷۱ء، ص ۲۶۶۔

۲۔ ایضاً، ۲۹۱۔

۳۔ پروفیسر حمید احمد خان: "ارمغانِ حالی"، طبع اول، لاہور، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۷۱ء، ص ۲۔

کے ذیل میں مؤلف نے "تریاقِ سموم" کو پہلے نمبر پر لکھا ہے جب کہ ڈاکٹر قیوم کے بہ قول ان کی پہلی تصنیف "مولود شریف" ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں خواجہ سجاد خلف مولانا حالی کے مقدمے کے ساتھ شایع ہوئی"۔[۱] اس کے بعد ڈاکٹر قیوم، خواجہ سجاد حسین کے مقدمے کے حوالے سے اس کتاب کو ۱۸۶۵ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان کی تصنیف بتاتے ہوئے اس کا ذکر پہلے نمبر پر کرتے ہیں۔ بعد ازیں مؤلف کا بیان ہے کہ "طباق الارض: فرنچ زبان کی تصنیف 'علم الارض' (جیالوجی) کا عربی زبان سے اردو ترجمہ کیا۔ پنجاب یونیورسٹی نے ۱۸۶۸ء میں چھاپا" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۶۳۳) مؤلف کے اس بیان سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کو اختلاف ہے چناں چہ لکھتے ہیں:

> "غالباً پروفیسر صاحب (حامد حسن قادری) نے شیخ محمد اسماعیل صاحب کے تذکرۂ حالی (صفحہ ۲۰) سے اس کتاب کا سال طباعت نقل کیا ہے۔ لیکن شیخ موصوف نے خود بھی غالباً ۱۸۶۸ء لکھا ہے اسی طرح یہ بھی دوسری جگہ لکھا ہے کہ ترجمہ لاہور ہی میں کیا تھا۔ چناں چہ تذکرۂ حالی میں صاف طور پر لکھتے ہیں کہ علم طبقات الارض پر ایک کتاب کا ترجمہ . . . لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور جو فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ

۱۔ ڈاکٹر عبدالقیوم: "مولانا الطاف حسین حالی"، تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند، نویں جلد، طبع اول، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، فروری ۱۹۷۲ء، ص ۱۱۷۔

کی تھی، اردو میں ترجم کیا"۔۱

مذکورہ تحریر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مولانا حالی نے یہ ترجمہ اپنے قیامِ لاہور کے زمانے میں یعنی ۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۴ء کے دوران کیا۔ اس کی تائید ڈاکٹر عبدالقیوم۲ نے بھی کی ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اسی کتاب کے ایک نسخے مطبوعہ ۱۸۸۳ء کے سرورق کی عبارت نقل کی ہے جس کے مطابق اس کا صحیح نام "مبادیِ علم جیولوجی"۳ ہے ان بیانات کی موجودگی میں حامد حسن قادری کا دیا ہوا نام غلط ثابت ہوجاتا ہے اور رہا سوال ۱۸۶۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے چھاپے جانے کا تو یہ بات طے ہے کہ ۱۸۶۸ء میں پنجاب یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی۔۴

اسی ذیل میں مؤلف مزید رقم طراز ہیں کہ " اصولِ فارسی:

۱۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں: "حالی کا ذہنی ارتقاء"، طبع دوم، لاہور، مکتبۂ کارواں، سنہ ۱۹۶۶ء، ص ۳۰۔

۲۔ ڈاکٹر عبدالقیوم: " مولانا الطاف حسین حالی"، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، طبع اول، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، فروری ۱۹۷۲ء، ص ۱۱۸۔

۳۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان: "حالی کا ذہنی ارتقاء" طبع دوم، لاہور، مکتبۂ کارواں، ۱۹۶۶ء، ص ۳۰۔

۴۔ پنجاب یونیورسٹی ۱۸۸۲ء میں قائم ہوئی، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (مقالہ "سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر" از ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، باب اول، جلد نہم، طبع اول لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء، ص ۲۴۔

زبان کے قواعد، (۱۸۶۸ء)" جب کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا کہنا ہے کہ "اسی زمانے میں (یعنی ۱۸۷۲ء) انھوں نے فارسی زبان کے قواعد پر ایک کتاب 'اصولِ فارسی' لکھی تھی"-۱ نیز شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اسے رسالہ نقوش بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شایع کردیا ہے-۲ ازاں بعد "شواھد الالتہام" کے بارے میں کوئی معلومات نہیں دی۔ تاہم ڈاکٹر قیوم کے ایک مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ "یہ مختصر رسالہ ۱۸۷۲ء میں لکھا گیا"-۳

اسی صفحے پر مؤلف نے "حیاتِ سعدی" کا سنِ اشاعت "۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء" لکھا ہے جب کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے بہ قول "۱۸۸۶ء کے اوائل میں سیرت نگاری پر مولانا حالی کی سب سے پہلی کتاب 'حیاتِ سعدی' شایع ہوئی"-۴ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مؤلف نے اسی کتاب کے صفحہ ۶۳۷ پر اس کتاب کا سنِ تالیف ۱۸۸۴ء لکھا ہے۔ آگے چل کر مولانا حالی کی دسویں تصنیف کا نام "مقدمۂ شعر و شاعری" لکھا ہے، اور سن "۱۳۱۰ھ/۱۸۸۳ء" لکھا ہے (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۶۳۳)۔

۱۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان: "حالی کا ذہنی ارتقا"، طبع دوم، لاہور، مکتبہ کارواں، ۱۹۶۶ء، ص ۳۲۔

۲۔ ڈاکٹر عبدالقیوم: "مولانا الطاف حسین حالی"، تاریخِ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند، نویں جلد؛ طبع اول، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، فروری ۱۹۷۲ء، ص ۱۱۸۔

۳۔ ایضاً، ص

۴۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان: "حالی کا ذہنی ارتقاء"، طبع دوم، لاہور؛ مکتبۂ کارواں، ۱۹۶۶ء، ص ۹۹۔

اس کے بعد صفحہ ۶۳۷ پر مؤلف رقم طراز ہیں کہ حیات سعدی (۱۸۸۴ء)، اور اس کے دس برس بعد مقدمہ شعر و شاعری لکھا" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۶۳۷) جب کہ حساب سے ۱۸۸۴ء کے دس سال بعد کا سال ۱۸۹۴ء بنتا ہے، اور خود مؤلف کے قول کے مطابق جس کا حوالہ اوپر دیا چکا ہے، "مقدمہ شعر و شاعری" کا سال اشاعت ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۳ء ہے، یہاں قاری کے لیے مشکل یہ ہے کہ کون سی بات پر یقین کرے؟ ویسے یہ قول ڈاکٹر وحید قریشی "مقدمہ شعر و شاعری مع 'دیوانِ حالی' ۱۸۹۳ء میں شایع ہوا"۔۱ چوں کہ ان کے پیش نظر پہلا ایڈیشن ہے اور انھوں نے اس ایڈیشن کے سرورق کی عکسی نقل بھی دی ہے اس لیے ۱۸۹۳ء والی بات درست ہے۔ حالی کی تیرھویں تصنیف "سوانح عمری مولانا عبدالرحمان" لکھی ہے لیکن اس کا ذکر مؤلف نے "حیاتِ جاوید" (۱۹۰۱ء) کے بعد کیا ہے، جبکہ ڈاکٹر قیوم نے اس کا نام "تذکرۂ رحمانیہ" لکھا ہے اور مزید یہ اطلاع دی ہے کہ "یہ مضمون 'چودھویں صدی' راولپنڈی میں ۱۸۹۶ء میں شایع ہوا تھا"۔۲

صفحہ ۶۳۵ پر مؤلف نے "مناجات بیوہ" کا سال تصنیف

۱۔ حالی: "مقدمہ شعر و شاعری" مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، طبع اول، لاہور، مکتبۂ جدید، ۱۹۵۳ء، ص ۱۰۔

۲۔ ڈاکٹر عبدالقیوم: "مولانا الطاف حسین حالی"، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان ہند، جلد چہارم، طبع اول، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۳ء، ص ۱۲۱۔

۱۸۸۷ء لکھا ہے۔ اس نظم کے سنہ تصنیف کے بارے میں اختلاف ہے کیوں کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے "تذکرۂ حالی" کے حوالے سے ۱۸۸۶ء یا ۱۸۸۷ء لکھا ہے اور محترم صالحہ عابد حسین نے بھی "یادگارِ حالی"۲ میں ۱۸۸۶ء یا ۱۸۸۷ء لکھا ہے، لیکن مالک رام اپنی تصنیف "حالی" میں رقم طراز ہیں:

"Munajat-i-Bewa, In 1884 he wrote his famous poem "Munajat-i-Bewa"۳۔ ازاں بعد "رحم و انصاف" کا سالِ تصنیف مؤلف نے ۱۸۷۵ء لکھا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے "حالی کا ذہنی ارتقاء"۴ میں اور ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے "کلیات نظم حالی"۵ میں اس نظم کا صحیح نام "مناظرۂ رحم و انصاف" اور سالِ تصنیف ۱۸۷۴ء لکھا ہے۔ (ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی مرتبہ "کلیات نظم حالی" میں اس نظم کا سالِ تصنیف فہرست میں بالکل درست یعنی ۱۸۷۴ء لکھا ہے گو کہ متن میں صفحہ ۱۱۴ پر ۱۸۷۶ء لکھا گیا ہے جو یقیناً ٹائپ کی غلطی ہے)۔ مؤلف نے

۱۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں: "حالی کا ذہنی ارتقاء"، طبع دوم، لاہور، مکتبۂ کارواں، ۱۹۷۱ء، ص ۹۵۔

۲۔ صالحہ عابد حسین: "یادگار حالی"، طبع اول، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۶۶ء، ص ۲۲۷۔

۳۔ مالک رام: "حالی"، (انگریزی) طبع اول، دہلی، ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۸۲ء، ص ۳۲۔

۴۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں: "حالی کا ذہنی ارتقاء"، طبع دوم، لاہور، مکتبۂ کارواں، ۱۹۷۱ء، ص ۳۸۔

۵۔ حالی: "کلیاتِ نظم حالی"، جلد اول، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، طبع اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء، ۱۱۴۔

"شکوۂ ہند" کا سالِ تصنیف ۱۸۸۶ء لکھا ہے۔ جب کہ اس کا صحیح سالِ تصنیف ۱۸۸۸ء ہے۔۱

صفحہ ۱۸۷ پر علامہ شبلی نعمانی کے ذکر میں ان کے نام سے متعلق حاشیے میں وضاحت کرتے ہوئے مؤلف رقم طراز ہیں کہ "حضرت شیخ ابو بکر شبلی کے نام میں (جن کے نام پر مولانا شبلی کا نام رکھا گیا تھا) شبلی ان کے وطن آبائی موضع شبلہ سے منسوب ہے"۔ جب کہ مولانا سید سلیمان ندوی کے مطابق "شبلی ان کے وطن شبلیہ (واقع اشروسنہ ترکستان) کی طرف منسوب ہے"۲ اس کے بعد مولانا فیض الحسن سہارن پوری کے حوالے سے مؤلف کا بیان ہے کہ "علامہ شبلی نے چھے مہینے ان کی صحبت میں رہ کر 'حمامہ' پڑھا، مولانا کو فرصت نہ ہوتی تو کالج کے راستے میں آتے جاتے پڑھادیتے" (داستانِ تاریخِ اردو، طبع سوم، ص ۱۹۷)۔ جب کہ اس سلسلے میں صحیح صورت حال یہ ہے کہ جب مولانا شبلی لاہور پہنچے تو انھیں معلوم ہوا کہ نہ صرف کالج میں ان کا داخلہ ناممکن ہے (اگر ان کا ارادہ تھا) بلکہ کالج کے باہر کے اوقات میں بھی مولانا کے درس میں شرکت کی کوئی صورت نہیں۔ بڑی کوشش کے بعد "آخرکار یہ طے ہوا کہ مکان سے کالج تک کی مسافت طے کرنے میں جو وقت ملے اسی میں مولانا ادبیات کا درس لیا کریں"۔۳ اس بیان کی تصدیق

۱۔ پروفیسر حمید احمد خان: "ارمغانِ حالی"، طبع اول، لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۱ء، ص ۲۲۵۔

۲۔ سید سلیمان ندوی: "حیاتِ شبلی"، طبع سوم، اعظم گڑھ، دار المصنفین، ۱۹۷۹ء، ص ۶۸۔

۳۔ ایضاً، ص ۸۲۔

"یادگار شبلی"۱ سے بھی ہوتی ہے، ان بیانات کی روشنی میں مؤلف کا یہ جملہ "علامہ شبلی نے چھے مہینے ان کی صحبت میں رہ کر 'حماسہ' پڑھا مولانا کو فرصت نہ ہوتی تو کالج کے راستے میں آتے جاتے پڑھادیتے" محض قیاس معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد اسی صفحے پر مؤلف مزید رقم طراز ہیں کہ علامہ شبلی نے لاہور سے سہارن پور کا سفر کیا اور مولانا احمد علی صاحب محدث سے حدیث پڑھی"۔ مؤلف کے اس بیان کا ماخذ سید سلیمان ندوی کی تصنیف "یادِ رفتگاں"۲ کا ایک مضمون ہے، جو اس مجموعے میں شامل ہونے سے پہلے رسالہ "معارف" اعظم گڑھ میں شایع ہوا تھا، اس کے مطابق ندوی صاحب کا بیان ہے کہ:

> "لاہور سے مولانا، سہارن پور مولوی احمد علی صاحب کی خدمت میں . . . حاضر ہوئے یہاں کچھ دنوں علم حدیث کی تحصیل فرمائی"۔۳

مذکورہ عبارت اور مؤلف کے ماٰخذ یعنی "یادِ رفتگاں" میں صرف یہ فرق ہے کہ اول الذکر میں لفظ "کچھ دنوں" قلم زد ہوگیا ہے اور "مولوی" کی جگہ لفظ "مولانا" نے لے لی ہے۔ اس کے بعد مؤلف کا مزید بیان ہے کہ شبلی کے "والد نے ان سے امتحان وکالت پاس کرنے

۱۔ شیخ محمد اکرم: "یادگارِ شبلی"، طبع اول، لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۱ء، ص ۳۶۔

۲۔ سید سلیمان ندوی: "یادِ رفتگاں"، طبع اول، کراچی، مکتبۃ الشرق ۱۹۵۵ء، ص ۱۷-۱۶۔

۳۔ سید سلیمان ندوی: "معارف" اعظم گڑھ، جلد اول، شمارہ ۲، بابت اگست ۱۹۱۶ء۔

کا اصرار کیا، علامہ بالطبع ادھر متوجہ نہ تھے کہنے سننے سے امتحان پاس کیا" (داستانِ تاریخِ اردو، طبع سوم، ص ۲۳ے) - اس سلسلے میں مؤلف کا بیان یہاں تک تو درست ہے کہ وکالت کے امتحان اور اس پیشے سے انہیں کوئی ذاتی دلچسپی نہیں تھی، اس طرف وہ والد کے اصرار پر متوجہ ہوئے، لیکن جب ان کے چھوٹے بھائی مہدی جو محض تفریحاً اس امتحان میں بیٹھے تھے، کامیاب ہوگئے تو شبلی نے سنجیدگی سے اس طرف توجہ کی اور ایک سال کی محنت کے بعد بھرپور تیاری سے امتحان دیا اور کامیاب ہوئے، اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ شبلی کا تیار کردہ مواد اتنا کارآمد تھا "کہ اس کی مدد سے ان کے چند احباب بھی وکالت کے امتحان میں کامیاب ہوئے"۔۱ اس کے بعد مؤلف مزید لکھتے ہیں کہ "بالآخر وکالت ترک کردی اور 'امین دیوانی' کی ملازمت اختیار کرلی . . . آخر یہ کام بھی مزاج کے موافق نہ نکلا، چھوڑ گھر بیٹھ رہے" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۳۳ے)۔ مؤلف کے مذکورہ بیان سے قاری کو یہ تاثر ملتا ہے کہ علامہ شبلی نے ترک وکالت کے بعد امین دیوانی کی ملازمت کی جب کہ شیخ محمد اکرام کے مطابق :

> "وکالت سے مایوسی کے بعد شبلی نے سرکاری ملازمت کا دروازہ کھٹکھٹایا اس وقت کلکٹر کی کچہری میں دس روپے کی نقل نویسی عارضی طور پر خالی تھی، مولانا کا اس پر تقرر ہوا۔ اس کے بعد قرقِ امین کی

۱۔ سید سلیمان ندوی : "حیاتِ شبلی"، طبع سوم، اعظم گڑھ :
دار المصنفین، ۱۹۷۹ء، ص ۱۱۳ -

اسامی خالی ہوئی تو شبلی کو دو مہینے کے لیے وہ جگہ دی گئی"۔۱

اس کے بعد مؤلف مزید رقم طراز ہیں کہ:

"علامہ کے چھوٹے بھائی مہدی حسن علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں یہ بھی وہاں گئے۔ سر سید سے ملے ... اتفاق سے وہاں پروفیسری کی جگہ خالی تھی۔ علامہ شبلی نے اپنے استاد مولانا فیض الحسن کی سفارش سے درخواست دی۔ سر سید نے فوراً چالیس روپے ماہ وار تنخواہ پر ان کو رکھ لیا" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۲۴۷)۔

اس سلسلے میں حقیقت یہ ہے کہ شبلی، چھوٹے بھائی مہدی حسن سے ملنے اپنے والد کے ہمراہ اکتوبر ۱۸۸۱ء میں علی گڑھ گئے اور وہاں پہنچ کر انھوں نے سر سید کی مدح میں ایک عربی قصیدہ سر سید کو پیش کیا جس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ اور سید سلیمان ندوی کی صراحت کے مطابق:

"اس واقعے کے ڈیڑھ سال بعد جب کالج کو مشرقی زبانوں کے ایک معلم کی ضرورت ہوئی تو شبلی نے مولانا فیض الحسن کی تصدیق و توثیق سے درخواست بھیجی اور بستی سے ... لکھنؤ ہوتے ہوئے علی گڑھ گئے ... ڈپٹی محمد کریم صاحب ... کے یہاں مقیم ہوئے اور انھی کی وساطت سے سر سید کے عزیز دوست

۱۔ شیخ محمد اکرام: "یادگارِ شبلی"، طبع اول، لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۱ء، ص ۶۹۔

اور رفیقِ کار مولوی محمد سمیع اللہ خاں سے ملے، انھوں نے کالج کی عربی و فارسی تعلیم کے لیے مولانا کا انتخاب کیا اور سر سید سے ملایا . . . دونوں کی پسند سے مولانا کا تقرر اسسٹنٹ عربک پروفیسر کے عہدے پر جنوری ۱۸۸۳ء کی کسی آخری تاریخ میں چالیس روپے ماہ وار پر ہوگیا اور پہلی فروری ۱۸۸۳ء سے مولانا نے کالج کا کام شروع کیا"۔۱ اس بیان کی تائید شیخ محمد اکرام ۲ نے بھی کی ہے۔

اس کے بعد مؤلف کا بیان ہے کہ "۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے مسٹر آرنلڈ پروفیسر علی گڑھ کے ساتھ قسطنطنیہ کا سفر کیا" (داستان تاریخ اردو، طبع سوم، ص ۲۵۷) جب کہ اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی کا کہنا ہے کہ "پروفیسر صاحب ۱۸۹۲ء میں جب انگلستان جانے لگے تو مولانا بھی ان کے ساتھ قسطنطنیہ کے سفر کے لیے آمادہ ہو گئے آخر انھی کے ساتھ پورٹ سعید تک سفر کیا، اور وہاں سے آگے تنہا گئے"۔۳

(۶)

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ دور

۱۔ سید سلیمان ندوی: "حیاتِ شبلی"، طبع سوم، اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۷۹ء، ص ۱۲۲۔

۲۔ شیخ محمد اکرام: "یادگارِ شبلی"، طبع اول، لاهور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۱ء، ص ۸۲۔

۳۔ سید سلیمان ندوی: "حیاتِ شبلی"، طبع سوم، اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۷۹ء، ص ۱۳۱۔

کے قاری کو اس کتاب کے مطالعے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے، کیوں کہ یہ تالیف ۴۸ برس پرانی ہے ہر چند کہ دو مرتبہ اس کتاب پر نظرثانی ہوئی لیکن پھر بھی بعض ترمیم طلب مقامات موجود رہے، اور پھر اب جب کہ علمی تحقیق نے بہت سے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھا دیا اور بہت سے تاریک گوشے منور کر کے ہماری ادبی تاریخ کے کئی مغالطے دور کردیے، یہ کتاب اپنی پرانی صورت میں اتنی مفید نہیں رہی جتنی یہ اب سے چند سال پہلے تھی، اس کتاب کو جامع بنانے کے لیے ضروری ہے کوئی وسیع المطالعہ ماہر، خوش عقیدگی اور تعصب سے بالاتر ہوکر اس پر نظرثانی کرے اور معلومات کی جانچ پڑتال کے لیے مختلف رسائل و جرائد اور تصانیف سے استفادہ کرے جو پورے برصغیر کے سرکاری، نیم سرکاری اور شخصی کتب خانوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور عام قاری کی دسترس سے باہر ہیں، نیز جہاں تک ممکن ہو اولین ماٰخذ تک رسائی حاصل کرے اور کتاب کی معلومات کو جدید دور تک لائے۔ اس سلسلے میں قاضی عبدالودود، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر گیان چند جین اور محمد عتیق صدیقی کی وسیع معلومات سے فائدہ اٹھائے، اور ترتیب و تدوین سے لے کر طباعت کے آخری مرحلے تک نگرانی کرے، تاکہ وہ غلطیاں جو اس وقت اس کتاب میں موجود ہیں آئندہ طباعت میں جگہ نہ پاسکیں مثلاً مؤلف نے تقریباً ہر مصنف کے ساتھ اس کی تصانیف کی فہرست بھی دی ہے جو بعض جگہ مکمل ہے اور بعض جگہ نامکمل، بعض کے ساتھ سالِ تصنیف یا سالِ اشاعت دیا ہے بعض کے ساتھ نہیں، یہی صورت اہم واقعات کی ہے کہیں اہم ادبی واقعات کا سنہ نہیں دیا اور کہیں نسبۃً کم اہم ادبی واقعات کا سنہ دیا ہے۔ یہی نہیں ہجری اور عیسوی سنین کے درمیان

عدم مطابقت کی مثالیں بھی اس کتاب میں عام ہیں، ان کے علاوہ سہوِ کاتب اور فہرست کی معلومات اور متن میں عدم مطابقت تو قاری کو بےحد کھٹکتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس تاریخ کی تدوین میں مؤلف نے اپنی یادداشت پر غیر معمولی بھروسا کیا۔ اس سلسلے میں ان کے شاگرد جمیل زبیری کی رائے ملاحظہ ہو:

> "انھوں نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ جس زمانے میں وہ 'داستانِ تاریخِ اردو' تحریر کر رہے تھے تو عالم یہ تھا کہ جتنا لکھ لیتے تھے وہ چھپنے چلا جاتا تھا۔ وہ اس تحریر کی صرف آخری سطر لکھ کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے اور صرف اسی ایک سطر کو سامنے رکھ کر آگے لکھنا شروع کر دیتے تھے"۔[۱]

اس طریقے کو کیا نام دیا جائے، یہ طریقہ کسی ناواسٹ کا تو ہو سکتا ہے لیکن ایک ادبی مؤرخ و محقق کو نہیں سجتا۔ ان سب باتوں کے علاوہ اتنی اہم کتاب میں اشاریے کا نہ ہونا ایک الگ ڈس کریڈٹ ہے، امید رکھنی چاہیے کہ آئندہ طباعت کے وقت ناشر ان باتوں کا خیال رکھیں گے: اس طرح یہ کتاب زیادہ مفید ہوگی۔

(۷)

حامد حسن قادری کی یہ تالیف منظرِ عام پر آتے ہی ادبی حلقوں کی توجہ کا مرکز بن گئی اور دھلی، لکھنؤ اور حیدرآباد (دکن) کے متعدد نقادوں نے اس کتاب سے متعلق ریڈیو پر تبصرے

۱- جمیل زبیری: "میرے استاد پروفیسر حامد حسن قادری"؛ غیر مطبوعہ مقالہ، مخزونہ ذخیرۂ ذاتی ڈاکٹر سرور اکبر آبادی، کراچی۔

کیے ، مؤلف کو خطوط لکھے اور رسائل میں ریویو شایع کرائے۔ غرض یہ کہ ہر سطح پر اس کتاب کا خیر مقدم کیا گیا۔

اس سلسلے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کا تبصرہ بہت اہم اور جامع ہے۔ اسی اہمیت و جامعیت کے پیشِ نظر تمام و کمال درج کیا جاتا ہے ، تاکہ اس کتاب کی اس وقت کی اہمیت و حیثیت کا اندازہ کیا جا سکے جب یہ پہلی مرتبہ شایع ہوئی :

" اس کتاب میں ابتدا سے بیسوی صدی تک اردو نثر کے مصنفین کا تذکرہ ہے۔ ابتدا میں اردو کے آغاز اور نشو و نما کا سرسری بیان ہے۔ اس کے بعد اردو کے چھے دور قائم کیے ہیں جو چودھویں صدی سے شروع ہوکر بیسویں صدی کے شروع پر ختم ہوتے ہیں۔ مؤلف نے ہر دور کے نثر کے مصنفین کے ضروری حالات اور ان کے کلام کا نمونہ دیا ہے اور ہر مصنف کے کلام پر تنقید بھی ہے۔ کلام کا نمونہ کہیں کہیں طویل ہو گیا ہے ، تنقید بے لاگ ہے اور عیب و ہنر دونوں پر نظر رکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ رائے میں اختلاف کی گنجائش رہتی ہے لیکن آخری ابواب میں جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے غور و فکر اور مطالعے کا نتیجہ ہے۔ مؤلف نے مصنفین کی فہرست بہت بڑھادی ہے۔ مثلاً مولوی منتاق حسین (نواب وقار الملک) ، مفتی صدرالدین آزردہ ؛ مفتی سعد اللہ رام پوری ، سید محمد میر عباس بن ناصر علی المورخ اور مولوی مسیح الزمان وغیرہ جیسے بہت سے لوگوں کا ذکر کیا ہے جو اردو مصنفین میں کوئی درجہ نہیں رکھتے۔

ان میں سے بعض لوگ عربی فارسی یا علوم قدیم کے بڑے عالم فاضل تھے لیکن اردو مصنفین میں ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ مفتی صدرالدین آزردہ کو محض ایک . . . کی بنا پر یا مفتی سعد اللہ کر " فقہ اکبر" کے ترجمے یا عباس بن ناصر علی کو "صبح کا تارہ" لکھنے پر (جو ترجمہ ہے) اردو نثر کے مصنفین میں شمار کرنا درست نہیں"۔

ابتدائی ابواب میں قابل مؤلف نے دوسروں کی تحقیق پر تکیہ کیا اور اس لیے بعض ایسے امور لکھ گئے جو یا تو غلط ہیں یا پایہ تحقیق کو نہیں پہنچے۔ مثلاً شیخ عین‌الدین گنج العلم کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے دکنی اردو میں کئی رسالے لکھے لیکن یہ واقعہ محتاج ثبوت ہے۔ یا مولوی نذر علی درد کے بیان پر تحریر فرمایا ہے کہ ناصر افضلی کا مکمل دیوانِ اردو غزلیات میرے پاس موجود ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ اگر وہ مجھ سے دریافت فرما لیتے تو یہ غلطی نہ ہونے پاتی۔ اس قسم کی دو ایک باتیں اور بھی ہیں لیکن چنداں قابل لحاظ نہیں۔

یہ کتاب بہت جامع ہے اور اس وقت تک اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب اس پائے کی نہیں لکھی گئی۔ یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لیے نیز عام طور پر ان لوگوں کے لیے بھی جو اردو کی نثر کی پرانی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں بہت مفید اور کارآمد ہے"۔[۱]

---

[۱] مولوی عبدالحق : "تبصرہ" مشمولہ اردو، جلد ۲۲، نمبر ۱، دہلی، انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، بابت جنوری ۱۹۴۲ء، ص ۱۴۶۔

مولوی عبدالحق کے اس تبصرے کا فائدہ یہ ہوا کہ دوسری طباعت کے موقعے پر ناصر افضلی کا ذکر حذف کردیا گیا۔ اس تبصرے کے بعد دوسرا قابلِ ذکر تبصرہ " زمانہ " کان پور کا ہے۔ اس میں تبصرہ نگار نے جن نکات کی نشان دھی کی وہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہی جس طرف مولوی عبدالحق پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں کہ " مصنفین کی فہرست بہت بڑھادی ہے۔" اس سلسلے میں فاضل مبصر چند اور نام سامنے لائے ہیں جنھیں آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا تھا مثلاً مرزا قتیل، سید اعظم علی اکبر آبادی، مولوی قطب الدین دھلوی اور امام بخش صہبائی۔ اس کے علاوہ مبصر نے چند ایسے ناموں کی نشان دھی بھی کی ہے جنھیں مؤلف نے غلط دور میں جگہ دی ہے مثلاً:

> "یوسف کمبل پوش کا ذکر سر سید کے دور کے بجائے غدر سے قبل کے دور میں ہونا چاہیے، اسی طرح شاہ محمد قاسم اور قطب الدین باطن کا ذکر بھی غدر سے قبل کے دور میں ہونا چاہیے ... پانچویں دور میں سر سید کے ساتھ امیر مینائی کو لکھنا بھی موزوں نہیں ... ان کو سر سید کے بجائے غالب اور غلام غوث بےخبر کے ہمراہ رکھنا چاہیے ... کتاب کو حالی اور آزاد کے دور پر ختم کرکے شرر اور سرشار جیسی جلیل القدر ہستیوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے"۔[۱]

یہی نہیں اس کے علاوہ اور بھی کئی بزرگوں نے اس کتاب پر اپنی رائے دی ہے جن میں علامہ نیاز فتح پوری اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اور مؤلف نے ان کا

۱۔ رسالہ زمانہ کانپور: جلد ۷۷، نمبر ۳، بابت ۱۹۴۲ء۔

بڑے خلوص کے ساتھ خیر مقدم کیا اور طبع دوم کے دیباچے میں شکریہ ادا کیا، اور بعض مقامات پر ان سے استفادہ بھی کیا؛ مثلاً تیسری اشاعت میں صفحہ ۲۲۷ پر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی اطلاعات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ماسٹر بنسی دھر کا ذکر بڑھا دیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی اور کئی مثالیں ہیں جو کتاب میں جابجا بکھری ہوئی ہیں۔

(۸)

اس کتاب کی تالیف کو اڑتالیس برس گزر چکے ہیں، اس لیے یہ کتاب اتنی مفید نہیں رہی جتنی یہ اپنی تالیف کے وقت رہی ہوگی، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ یہ کتاب اپنے تمام امکانات پورے کر چکی ہے، یہ کتاب حوالے کے علاوہ بالواسطہ یا بلا واسطہ اب بھی نصابی کتاب شمار ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے موضوع پر نہایت مفصل کتاب ہے اور ہر طبقے کی ضروریات پوری کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کی خوبیوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ بعض حوالوں سے یہ کتاب تقدم کی فضیلت بھی رکھتی ہے مثلاً اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ کا ذکر اس نوعیت کی دیگر کتب میں بھی موجود ہے، لیکن جس عمدگی سے ان بزرگوں کا ذکر مؤلف نے کیا ہے وہ اب تک کسی سے نہ بن پڑا۔

ایک اور خوبی تالیفی دیانت ہے جس کی بکثرت مثالیں اس کتاب میں ملتی ہیں۔ تالیفی دیانت سے میری مراد یہ ہے کہ مؤلف نے جتنی کتابوں سے استفادہ کیا اور اس استفادے کی جو بھی نوعیت ہے، اس کی صراحت مؤلف نے کی ہے۔ ویسے مستثنیات کی

گنجائش ہر جگہ رہتی ہے ، اس کے علاوہ مؤلف نے اردو نثر کی تاریخ کو جس طرح چھے ادوار میں تقسیم کیا ہے اور انھیں جس طرح باہم مربوط کیا ہے (بجز چند ایک جزوی خامیوں کے) وہ بھی اپنی جگہ قابل تعریف ہے۔

ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ مؤلف کے تنقیدی شعور نے بھی اسے مقبول بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے ، کیوں کہ اس کتاب میں تنقید کا جو معیار ہے وہ اس سے پہلے تو درکنار اس کے بعد کی کتابوں میں بھی کم ہی نظر آتا ہے۔ اس تنقیدی شعور سے مؤلف نے اس تالیف کی ترتیب و تدوین میں بہت مدد لی ہے ، اور جہاں کہیں اقتباس دیا ہے ، اس کے لیے ایسا حصہ منتخب کیا ہے جس میں صاحب تحریر کا اسلوب اور دیگر خصوصیات نمایاں ہیں۔ اس بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو کام مؤلف نے چند سطور سے لیا ہے ، بعض لوگ طویل تحریروں سے نہیں لے سکے۔ اور یہ کہ خامیوں کے باوجود یہ کتاب عام قاری اور طلبہ کے لیے آج بھی افادیت رکھتی ہے۔

ضمیمہ

حامد حسن قادری نے اپنی اس تالیف کی تدوین و ترتیب کے لیے جن مضامین و کتب اور رسائل و جرائد سے استفادہ کیا، اصل متن یا حواشی میں ان کی نشان دھی بھی کی ہے ؛ جو بلاشبہ تدوینی دیانت کا ثبوت ہے ، لیکن جو رسمی طریقہ بالعموم اس نوعیت کی

کتابوں میں اختیار کیا جاتا ہے ، یعنی یہ کہ آخر میں کتابیات ایک نظم و ترتیب کے ساتھ درج کی جاتی ہے ؛ اس سے یہ اہم کتاب خالی ہے ۔ اور بعد کے ایڈیشنوں میں بھی اس کمی کو دور نہیں کیا گیا ۔

یہاں داستان تاریخ اردو کے ماخذات کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے ، اس سے مؤلف کے معیارِ تدوین اور ذوقِ تحقیق کا بھی پتہ چل سکے گا ۔ ان ماخذات میں سب سے نمایاں ، فاضل مصنفینِ حیدرآباد (دکن) کی تصانیف ہیں ، جنھوں نے "اردو کی ابتدائی تاریخ کے متعلق بہترین معلومات فراہم کردی ہیں"۱ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ "آب حیات" اور "سیرالمصنفین"۲ کے علاوہ

۱۔ حامد حسن قادری : "داستان تاریخ اردو"، طبع اول ، آگرہ ، لکشمی نرائن اگروال ، ۱۹۴۱ء ، ص؟

۲۔ مؤلف نے کلیم دھلوی کے ذکر میں طبع اول ص؟ ، طبع دوم ص ۱۴۳ طبع سوم ص ۱۶۵ پر "آبِ حیات" "سیرالمصنفین" اور "یوپی میں اردو" کے حوالے سے لکھتے ہیں :

> "میر حسن نے کلیم کا صرف ایک فقرہ احمد شاہ بادشاہ دھلی کے نابینا ہونے کے متعلق نقل کیا ہے ، یہی فقرہ تبرک کی طرح تمام مصنفین 'آب حیات' و 'سیرالمصنفین' و 'یو پی میں اردو' وغیرہ میں دست بدست منتقل ہوتا رہا ہے ۔ ہم بھی اسی کا لہو لگا کر شہیدوں میں ملے جاتے ہیں . . . "

جب کہ اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اپنے تحقیقی مقالے "اردو نثر کا آغاز و ارتقا" میں رقم طراز ہیں کہ:

(بقیہ صفحہ ۲۵۳ پر)

"اردوے قدیم"، "دکن میں اردو" اور "اردو شہپارے" مؤلف کے پیش نظر رہیں۔ فورٹ ولیم کالج سے متعلق "اربابِ نثر اردو" اور اولیائے کرام کے سلسلے میں انھوں نے "اردو کی ترقی میں صوفیائے کرام کا کام" سے استفادہ کیا۔

ان کے علاوہ کہیں کہیں "خزینۃ الاصفیاء"، "سیرالاقطاب"، "تاریخِ فرشتہ"، "تذکرۂ محبوب الزمن"، "منتخب التواریخ"، اور "تاریخِ ادبِ فارسی در عہد سلاطین مغلیہ" کے حوالے بھی ملتے ہیں۔

اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ اور دیگر اہم شخصیات کےلیے انھوں نے شعرائے اردو کے تذکروں، "خطباتِ گارساں دتاسی"، "چند ہم عصر" اور دیگر معاصرین کی تحریروں سے معلومات حاصل کیں، مرزا غالب کے لیے انھوں نے "یادگارِ غالب" اور غالب کے خطوط کے مجموعوں مثلاً "عود ہندی"، "اردوے معلیٰ" سے اشاعتِ اول کے وقت اور نظرِ ثانی کے لیے "مکاتیب غالب" مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی سے مدد لی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۲ سے)

"جہاں تک سیر المصنفین کا تعلق ہے، مرتب کو اس میں نہ تو کوئی اردو فقرہ محمد حسین کلیم کا ملا اور نہ ان کا تذکرہ۔ سیر المصنفین میں سرے سے کلیم کا ذکر ہی نہیں ہے۔ پتا نہیں پھر یہ تسامح قادری صاحب کو کس طرح ہوا"۔ (ڈاکٹر رفیع سلطانہ: "اردو نثر کا آغاز و ارتقا"، پاکستانی ایڈیشن، کراچی، کریم سنز پبلیشرز، ۱۹۷۸ء، ص ۳۵۲) - "سیر المصنفین" میں یہ ذکر ہمیں بھی نہیں ملا۔

سر سید کے سلسلے میں "حیات جاوید"، علامہ اقبال کے لیے "ملفوظات اقبال"، مرتبہ محمود نظامی وغیرہ کو سامنے رکھا۔ اسی طرح "الکلام"، "تذکرۂ نواب وقارالملک" مرتبہ مولوی محمد امین زبیری اور مفتی انتظام‌اللہ شہابی کی تصانیف "فضلائے ہند" اور "یو پی میں اردو" (رسالہ کنول، آگرہ) کو بھی مؤلف نے مستند ماخذ کے طور پر برتا۔

ان تصانیف کے علاوہ نظر ثانی کے موقعے پر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی معلومات اور اس نوع کے کئی اور ذرائع ہیں جنھیں مؤلف کام میں لائے اور کتاب کو بہتر سے بہتر بنایا۔ تاہم طبع اول کے موقعے پر میر نذرعلی درد کاکوروی کی ذاتی معلومات اور اپنی خاندانی روایات بھی مؤلف کا ماخذ رہیں، جسے ایک کمزوری ہی کہا جا سکتا ہے۔

مذکورہ ذرائع کے علاوہ، جو رسائل و جرائد مؤلف کے پیش نظر رہے ان میں "اردو"، "مخزن"، "زمانہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ رسائل اپنے وقت کے بہترین مجلے تھے۔

کتابیات

۱- آزاد ، مولانا محمد حسین : " آب حیات" ، طبع شانزدھم ، لاھور ، شیخ غلام علی ، ۱۹۵۴ء -

۲- آزاد ، مولانا محمد حسین : " سخن دان فارس" ، دیباچہ از طاھر نبیرۂ آزاد ، طبع دوم، لاھور ، آزاد بک ڈپو ، ۱۹۵۷ء -

۳- آہ ، شاہ محمد ممتاز علی : " امیر مینائی" ، طبع اول ، لکھنؤ ، ادبی پریس ، ۱۹۳۱ء -

۴- اسلم فرخی ، ڈاکٹر : "محمد حسین آزاد" ، جلد دوم ، طبع اول، کراچی ، انجمن ترقیٔ اردو ، ۱۹۶۵ء -

۵- افتخار احمد صدیقی ، ڈاکٹر : "مولوي نذیراحمد دھلوی — احوال و آثار" ، طبع اول ، لاھور ، مجلس ترقیٔ ادب ، ۱۹۷۱ء -

۶- افسوس ، میر شیرعلی : " آرایش محفل" ، مقدمہ از کلب علی خاں فائق ، طبع اول ، لاھور ، مجلس ترقیٔ ادب ، ۱۹۶۳ء -

۷- اکرام ، شیخ محمد : "یادگار شبلی" ، طبع اول ، لاھور ، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ ، ۱۹۷۱ء -

۸- امیر احمد علوی : " طرۂ امیر" ، طبع اول ، لکھنؤ ، انوار المطالع ، ۱۹۲۸ء -

۹- ایوب قادری ، ڈاکٹر ، پروفیسر : " مرقع شہابی" ، کراچی ، جناح لٹریری اکیڈمی ، ۱۹۷۹ء -

۱۰- تحسین ، میر حسین عطا خاں : " نو طرز مرصع" ، مرتبہ نورالحسن ھاشمی ، طبع اول ، الہ آباد ، ھند ستانی اکیڈمی ، ۱۹۵۸ء -

۱۱- جاوید نہال ، ڈاکٹر : " بنگال کا اردو ادب" ، طبع دوم ، کلکتہ ، عثمانیہ بک ڈپو ، ۱۹۸۱ء -

۱۲- جمیل جالبی، ڈاکٹر: "تاریخ ادب اردو"، جلد اول، طبع دوم، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۸۴ء۔

۱۳- جمیل جالبی، ڈاکٹر: "تاریخ ادب اردو"، جلد دوم، طبع دوم، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۸۲ء۔

۱۴- حالی، مولانا الطاف حسین: "یادگار غالب"، مرتبہ خلیل الرحمان داؤدی، طبع اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء۔

۱۵- حالی، مولانا الطاف حسین: "مقدمہ شعر و شاعری"، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور، مکتبۂ جدید، ۱۹۵۳ء۔

۱۶- حالی، مولانا الطاف حسین: "کلیات نظم حالی"، مرتبہ افتخار احمد صدیقی، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۵۲ء۔

۱۷- حامد حسن قادری: "داستان تاریخ اردو"، طبع اول، آگرہ، لکشمی نرائن اگروال، ۱۹۴۱ء۔

۱۸- حامد حسن قادری: "داستان تاریخ اردو"، طبع دوم، آگرہ، لکشمی نرائن اگروال، ۱۹۵۷ء۔

۱۹- حامد حسن قادری: "داستان تاریخ اردو"، طبع سوم، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۳ء۔

۲۰- حفیظ الدین احمد: "خرد افروز"، مقدمہ از عابد علی عابد، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۶۳ء۔

۲۱- حمید احمد خان، پروفیسر: "ارمغان حالی"، طبع اول، لاہور، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۷۱ء۔

۲۲- حیدر، سید آغا: "مطالعۂ آب حیات"، طبع اول، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، ۱۹۶۹ء۔

۲۳- خلیق انجم ، ڈاکٹر : "مرزا محمد رفیع سودا" ، طبع اول ، علی گڑھ ، انجمن ترقیٔ اردو (ہند) ، ۱۹۶۶ء -

۲۴- رضیہ نور محمد ، مس ، ڈاکٹر : "اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی و ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" ، طبع اول ، لاہور ، مکتبۂ خیابان ادب ، ۱۹۸۵ء -

۲۵- رضیہ سلطانہ ، ڈاکٹر : "اردو نثر کا آغاز و ارتقاء" ، کراچی ، کریم پبلیشرز ، ... -

۲۶- سحر ، ابومحمد ، ڈاکٹر : "مطالعۂ امیر" ، طبع اول ، لکھنؤ ، نسیم بک ڈپو ، ۱۹۶۴ء -

۲۷- سکسینہ ، رام بابو : "تاریخ ادب اردو" ، مترجم مرزا محمد عسکری ، لاہور ، علمی کتاب خانہ ، جدید ایڈیشن ۱۹۸۱ء -

۲۸- سلیمان ندوی ، سید : "حیات شبلی" ، طبع سوم ، اعظم گڑھ ، دارالمصنفین ، ۱۹۷۹ء -

۲۹- سلیمان ندوی ، سید : "یاد رفتگاں" ، طبع اول ، کراچی ، مکتبہ شرق ، ۱۹۵۵ء -

۳۰- سودا ، مرزا محمد رفیع : "کلیات سودا" مرتبہ محمد حسن ، طبع اول ، دھلی ، ترقیٔ اردو بورڈ ، ۱۹۷۰ء -

۳۱- سید محمد ، مولوی : "ارباب نثر اردو" ، طبع اول ، حیدرآباد (دکن) ، مکتبۂ ابراھیمیہ ، ۱۹۳۷ء -

۳۲- شیخ چاند : "سودا" ، طبع دوم ، کراچی ، انجمن ترقیٔ اردو ، ۱۹۶۳ء -

۳۳- شیفتہ ، نواب مصطفیٰ خان : "گلشن بے خار" ، طبع اول ، لاہور ، مجلس ترقیٔ ادب ، ۱۹۸۳ء -

۳۴- صالحہ ، عابد حسین : "یادگار حالی" ، طبع اول ، لاہور ، آئینہ ادب ، ۱۹۶۶ء -

۳۵- عبدالحق ، مولوی ، ڈاکٹر : "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" ، طبع پنجم ، کراچی ، انجمن ترقیٔ اردو ، ۱۹۸۶ء -

۳۶- عبدالحق ، مولوی ، ڈاکٹر : "قدیم اردو" ، طبع اول ، کراچی ، انجمن ترقیٔ اردو ، ۱۹۸۱ء -

۳۷- عبدالحکیم حکمت ، سید محمد : "دبدبۂ امیری" ، طبع اول ، پٹنہ ، برقی مشین پریس - ۱۹۳۷ء -

۳۸- عتیق صدیقی : محمد : "گل کرسٹ اور اس کا عہد" ، طبع اول ، نئی دہلی ، انجمن ترقی اردو (ہند) ، ۱۹۷۹ -

۳۹- عتیق صدیقی : "صوبہ شمالیٔ ، مغربی کے اخبارات و مطبوعات" ، طبع اول ، علی گڑھ ، انجمن ترقیٔ اردو (ہند) ، ۱۹۶۶ء -

۴۰- غالب ، مرزا اسداللہ خان : "دیوان غالب" ، (نسخہ عرشی) مرتبہ امتیاز علی خان عرشی ، طبع اول ، علی گڑھ ، انجمن ترقیٔ اردو (ہند) ، ۱۹۵۷ء -

۴۱- غالب ، مرزا اسداللہ خان : "خطوط غالب" ، مرتبہ غلام رسول مہر ، طبع پنجم ، لاہور ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، ۱۹۸۲ء -

۴۲- غلام رسول مہر ، مولانا : "غالب" ، طبع چہارم ، لاہور ، شیخ مبارک علی ، ۱۹۴۶ء -

۴۳- غلام حسین ذوالفقار ، ڈاکٹر : "محاسن خطوط غالب" ، طبع اول ، لاہور ، مکتبۂ خیابان ادب ، ۱۹۶۹ء -

۴۴- غلام مصطفیٰ خان ، ڈاکٹر : "حالی کا ذہنی ارتقاء" ، طبع دوم ، لاہور ، مکتبۂ کاروان ، ۱۹۷۱ء -

۴۵۔ غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر: "علمی نقوش"، کراچی، اعلیٰ کتب خانہ، ناظم آباد، ۱۹۵۷ء۔

۴۶۔ فتح علی گردیزی حسینی: "تذکرۂ ریختہ گویاں"، مرتبہ مولوی عبدالحق، طبع اول، اورنگ آباد (دکن)، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۳ء۔

۴۷۔ فرحت اللہ بیگ، مرزا: "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی"، طبع دوم، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۱ء۔

۴۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: "شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرۂ نگاری" طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۷۲ء۔

۴۹۔ قدرت اللہ قاسم، حکیم: "مجموعہ نغز"، مرتبہ حافظ محمود خان شیرانی، طبع اول، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۳۳ء۔

۵۰۔ کریم الدین احمد، ڈاکٹر: "امیر احمد مینائی اور ان کے تلامذہ"، طبع اول، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۸۲ء۔

۵۱۔ کیفی، پنڈت برج موہن دتاتریہ: "منشورات"، طبع چہارم، لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۵۰ء۔

۵۲۔ گیان چند جین، ڈاکٹر: "اردو کی نثری داستانیں"، طبع دوم، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۶۹ء۔

۵۳۔ مالک رام: "حالی"، (انگریزی) طبع اول، دھلی، ساھتیہ اکیڈمی، ۱۹۸۲ء۔

۵۴۔ محمد صادق، ڈاکٹر: "محمد حسین آزاد۔ احوال و آثار"، طبع اول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء۔

۵۵۔ محمود خان شیرانی، حافظ: "پنجاب میں اردو"، طبع چہارم، لاہور، مکتبہ معین الادب، ...۔

۵۶- مخمور اکبرآبادی، سید محمد رضوی: "نظیر نامہ"، کراچی، مشہور آفسیٹ پریس، ۱۹۷۹ء۔

۵۷- مہجور، محمد بخش: "نورتن"، مقدمہ از خلیل الرحمٰن داؤدی، طبع اول، لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۶۲ء۔

۵۸- میر تقی میر: "نکات الشعراء"، طبع دوم، کراچی، انجمن ترقیٔ اردو، ۱۹۷۹ء۔

۵۹- میر حسن دہلوی: "تذکرۂ شعرائے اردو"، بہ تصحیح و تنقید مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۳۰ء۔

۶۰- نادم سیتاپوری: "فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی"، لکھنؤ، ادارۂ فروغ اردو، ۱۹۵۹ء۔

۶۱- نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر: "تلاش غالب" طبع اول، لاہور، کتابیات، ۱۹۶۹ء۔

۶۲- نصیرالدین ہاشمی: "کتب خانۂ آصفیہ کے اردو مخطوطات"، جلد اول، طبع اول، حیدرآباد (دکن)، خواتین دکن انسٹیٹیوٹ، ۱۹۶۱ء۔

۶۳- نقی محمد خاں خورجوی: "حیات امیر خسرو"، لاہور، شیخ غلام علی۔

۶۴- وحید قریشی، ڈاکٹر: "نذر غالب"، طبع دوم، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۰ء۔

غیر مطبوعہ مقالۂ تحقیق

۱- جمیل زبیری: حامد حسن قادری پر غیر مطبوعہ مقالہ مخزونہ ذخیرہ ڈاکٹر سرور اکبر آبادی۔

۲- سرور اکبرآبادی، ڈاکٹر : غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی۔ ایچ ۔ ڈی، شعبۂ اردو، جامعہ سندھ، جام شورو۔

مکتوب

۱- مکتوب جناب علاؤالدین خالد، کراچی بنام راقم، مورخہ ۲۹ جنوری ۱۹۸۹ء۔

رسائل

۱- سہ ماہی اردو، انجمن ترقی اردو، دھلی، بابت ۱۹۴۲ء۔
۲- ادبی دنیا، لاہور، بابت دسمبر ۱۹۴۰ء۔
۳- زمانہ، کان پور، جلد ۷۷، نمبر ۳، بابت ۱۹۴۲ء۔
۴- شفق، کراچی، بابت جولائی ۱۹۷۷ء۔
۵- نقوش، لاہور، ادارۂ فروغ اردو۔ شمارہ ۱۰۵، ۱۹۶۶ء اور شمارہ ۱۱۸، سالنامہ ۱۹۷۳ء۔